زرِ گل

حفیظ الرحمان واصف

آزمائشگہ غم میں دلِ نازک کو نہ لا
کہ زرِ گل نہیں ہوتا کبھی معیارِ طلب

زرِ گل

یعنی
مجموعہ کلامِ واصف

ناشر	حفیظ الرحمان واصف
نام مطبع	نعمانی پریس دہلی
تعداد طباعت	پانسو
ایڈیشن	طبع اول
تعداد صفحات	۲۲۴
سال طباعت	۱۹۷۶ء
نام کاتب	محمد عیسیٰ کشمیری
قیمت کتاب	

ملنے کے پتے

(۱) انجمن ترقی اردو بکڈپو۔ اردو بازار۔ دہلی

(۲) سنٹرل بکڈپو — اردو بازار۔ دہلی

دیباچہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمد اللہ العلی العظیم و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

یہ حقیر مجموعۂ کلام جو اہل نظر کے سامنے حاضر کیا جا رہا ہے محض اپنی کاوش فکر کو محفوظ کر دینے کے لئے ہے۔ اردو ادب میں اس سے کوئی اضافہ مقصود نہیں۔

اس دفتر بے معنی کو شائع کرنے کی ہمت نہیں تھی مگر قادر مطلق نے کچھ ایسے اسباب مہیا فرما دیئے کہ منتشر اوراق نے کتاب کی شکل اختیار کر لی۔

بہ فیض سائل شیریں نوا بزم ادیباں میں
بایں کم مائگی واصف پئے عرض ہنر آیا

یہ مجموعۂ کلام جو میری پریشان خیالی، پراگندہ دلی اور کوتاہ علمی کا مرقع ہے حروف تہجی کے لحاظ سے چند ردیفوں میں محدود ہے۔ روایتی دیوان کی صورت میں نہیں ہے۔ بس یہی کل کائنات ترجمان جذبات ہے۔ اس کا نام میں نے زرگل رکھا ہے۔ اور اس کو اپنے استاد محترم نواب ابو المعظم مرزا سراج الدین احمد خان سائل مرحوم و مغفور کے نام معنون کرتا ہوں۔ کاش کہ وہ زندہ ہوتے اور استادانہ و مربیانہ شفقت کے ساتھ زرگل کو دیکھ کر خوش ہوتے اور دعا

دیتے۔

افسوس زرِ گل ایسے زمانے میں شائع ہو رہا ہے کہ اب اس کو دیکھ کر خوش ہونے والے اور دعا دینے والے نہ رہے۔

حضرت والد ماجد مفتی اعظم علامہ مولانا محمد کفایت اللہ نور اللہ مرقدہ اللہ کو پیارے ہوئے جو عالمِ اسلام کے مایۂ ناز فقیہ و محدث ہونے کے علاوہ ایک اعلیٰ ادیب اور عربی و فارسی کے شاعر تھے اور ان کے زیرِ سایہ میری گھٹی میں ادبی ذوق شامل ہوا استاد محترم حضرت سائل اعلیٰ اللہ مقامہٗ بھی جنت کو سدھارے جن کی شفقتوں نے میرے ذوقِ سخن کو پاؤں پاؤں چلنا سکھایا۔ حضرت نوحؔ ناروی مرحوم بھی جا سوئے جو میرے لئے استاد مرحوم کا بدل تھے۔ جنھوں نے استاد مرحوم کی وفات کے بعد میری بہت کچھ رہنمائی فرمائی اور اپنی ایک تحریر میں میرے کلام پر تقریظ لکھنے کا وعدہ بھی فرمایا۔

کہیو جاکر بصد آداب ہمارا بھی سلام

اے صبا! تو جو شبستانِ عدم تک پہنچے

جانتے ہو؟ اگر یہ مجموعہ ان شفیق بزرگوں کی حیات میں شائع ہوتا تو کیا ہوتا؟ والد ماجد کے سامنے "زرِ گل" کو ڈرتے ڈرتے پیش کرتا تو دل میں تو خوش ہوتے مگر بڑی سنجیدگی سے میری طرف دیکھ کر فرماتے۔ "یہ تمھاری غزلوں کا مجموعہ ہے؟ اب تو شعر کہنا آگیا ہے۔ اور میں بظاہر سہمتا ہوا دل میں خوش ہوتا۔

سائل صاحب کے سامنے پیش کرنے کا انداز کچھ اور ہوتا۔ دل کی گہرائیوں میں یہ گستاخانہ خیال پنہاں ہوتا کہ اس میں اگر عیوب و نقائص ہیں تو ان کے ذمہ دار آپ ہیں۔ بے دھڑک پیش کرتا۔ وہ دیکھ کر بڑے زور سے ہنستے اور میرے ایک چپت رسید کرتے اور میرا دل ناچنے لگتا (وہ اپنے شاگردسے جب بہت خوش ہوتے تھے تو

چپت لگا دیا کرتے تھے)

نوح صاحب کے سامنے اس طرح پیش کرتا کہ گویا میرا حق ہے کہ ان سے داد لوں اور تقریظ لکھواؤں۔ اور وہ سبحان اللہ کہتے، بیاد کیا دیتے، اور تقریظ بھی لکھتے

"یہ باتیں ہیں جب کی کہ آتش جواں تھا"

آہ! ان آنکھوں نے کیا کیا دیکھا اور ابھی خدا جانے اور کیا کیا دیکھنا ہے۔ یاد ش بخیر دہلی مرحوم دیکھتے ہی دیکھتے کیا سے کیا ہو گئی۔

ماضی کا تذکرہ جو کیا تو نے ہم نشین
اک نیز بر سے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

اب ان پاک روحوں کا جلوہ ہمیں کہاں نصیب ہو گا جن کی زبان فیض ترجمان کا ایک ایک کلمہ بڑی بڑی کتابوں کے مطالعہ اور سالہا سال کی تحقیق و تلاش سے بے نیاز کر دیتا تھا۔

جلوہ افگن تھیں یہاں کیا کیا مبارک ہستیاں — دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں سے پنہاں ہو گئیں
اب کہاں دا صف ملیں گی وہ گزشتہ صحبتیں — اب وہ باتیں سر بسر خواب پریشاں ہو گئیں

اللہ تعالیٰ میرے تمام اکابر و اساتذہ کی خوابگاہوں کو منور فرمائے اور ان کی ارواح طیبہ کو اپنی خاص رحمتوں سے نوازے۔ آمین۔

بہرحال یہ حقیر ادبی کاوش امتحانگاہ ادب میں آرہی ہے۔ معاصر شعرا و ادبا اس کو ناقدانہ نظر سے پرکھیں گے۔ فن کی کسوٹی پر کسیں گے اور کھوٹا کھرا الگ کر دکھائیں گے یہ تو جو کچھ ہو گا باعث ممنونیت ہو گا۔ لیکن ایک خوف بھی میرے دل پر طاری ہے۔ وہ خود اپنی ہی جماعت کا خوف ہے جس کی داد نہ فریاد۔

زرگل کو اگر کسی ستم ظریف نے کسی مدرسہ میں پہنچا دیا تو وہ حضرات جن کی سخن فہمی کا سمند ناز نہیں کہا جا سکتا کہ کدھر مڑ جائے۔ وہ میرا کیا حال بنائیں گے اور زرگل کے

ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ دعا ہے کہ حکیم سخن آفریں اس حقیر ادبی کاوش کو ان کرم فرماؤں کی نگاہ خوردہ بیں سے بچائے۔ آمین۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِین

راقم حفیظ الرحمان واصف ابن حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ رح

ساکن اردو بازار نزد جامع مسجد دہلی

مہتمم مدرسہ امینیہ اسلامیہ کشمیری دروازہ دہلی

۹ رجمادی الثانی ۱۳۹۶ھ م ۸ رجون ۱۹۷۶ء

دعویٰ نہیں واصف کسی فن میں مجھ کو
حاصل نہیں شہرت بھی وطن میں مجھ کو
قدر اس لئے کرتے ہیں سخنور میری
سائل سے تلمذ ہے سخن میں مجھ کو

پیش لفظ

ناخدائے سخن حضرت نوح ناروی مرحوم

میں جناب مولانا واصف صاحب سے اس وقت سے واقف ہوں جب بھائی سائل صاحب زندہ تھے۔ پہلی ملاقات مولانا سے بھائی سائل صاحب کے مکان ہی پر ہوئی۔ اس کو میرے خیال میں آٹھ نو برس ہوئے ہوں گے اس زمانے میں کئی بار میں دلّی آیا اور برابر واصف صاحب سے ملتا رہا۔ بھائی سائل صاحب کی طرح میرا ابھی معمول ہے کہ جب تک میں دلی میں رہتا ہوں بعد نماز مغرب مولانا کے کتب خانے میں روزانہ کچھ دیر کے لئے بیٹھتا ہوں۔ اور اس مختصر سی نشست میں ادبی باتیں خاص طور سے ہوتی ہیں۔ میں نے بیشتر مولانا کا کلام ان کی زبان سے بھی سنا اور رسالوں میں بھی دیکھا۔ ان وجوہ پر میں کہہ سکتا ہوں کہ علاوہ غیر معمولی دینی قابلیت کے انھیں شاعری میں خاص دخل ہے اور یہ ایک ممتاز شاعر کہے جانے کے مستحق ہیں۔ اگر ان کا کلام کسی وقت شائع ہوا اور میں زندہ بھی رہا تو تفصیلی پیش لفظ یا تقریظ لکھوں گا۔ اس وقت یہی مختصر تحریر میرے دل کی آواز ہے۔ فقط ۵ رفروری ۱۹۵۳ء

نوح ناروی

حمد

نباشد عقل را نیروئے پرواز — ز بے بالی و پری در خلوت راز
حکیم و حاکم و رحمٰن و ارحم — نہ گنجد اندرو بیشی و نے کم
بسر دارند گردش آسیا وار — زحل شمس و قمر ہم چرخ دوّار
بصحرائے جنونش راہ پیما — چہ مجنوں و چہ فرہاد و چہ موسیٰ
بہار باغ خرم از نسیمش — گل و ریحاں معطر از شمیمش
ہماں یکتا و بے ہمتا ند براست — ہمالے نے عدیلے نے نظیر است
کرا طاقت کہ گوید حمد منعم — کہ پوشد عیبہائے بندہ دائم
بہ پیشش خور چہ تابد ذرۂ خاک — "چہ نسبت خاک را با عالم پاک"

ز تعریفش زباں کوتہ کن آصف
کہ از توصیف ذاتش ماندہ واصف

یہ نظم میری سب سے پہلی شاعری ہے۔ آصف تخلص تھا۔ بچپن اور طالب علمی کا زمانہ۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ آصف اور واصف کا قافیہ بروئے لغت نادرست ہے

واصف

ہدیۂ عقیدت بہ بارگاہِ رسالت

اے ساکنانِ طیبہ! تم کو بھی کچھ خبر ہے؟
دیکھو تو عاشقوں کو کیا دل ہے کیا جگر ہے

محبوب! تیری منزل بھولا نہیں مرا دل
اُف! کیا کروں کہ حائل پہنائے بحر و بر ہے

یہ در وہ در ہے جس سے خالی پھرا نہ کوئی
اک لمحۂ وفا بھی مقبول و معتبر ہے

اک آہ میں نہاں ہے افسانۂ محبت
لے جا صبا! کہ دل کا پیغام مختصر ہے

ہاں ہاں وہ سبز گنبد صلّوا علیٰ محمد
دشتِ جنوں کی سرحد مقصود و منتظر ہے

اب یہ کھلا کہ تم تھے آدمؑ کے آئنہ میں
جیسے رخِ قمر میں خورشید جلوہ گر ہے

دل میں مرے مکیں ہو آنکھوں سے گو نہاں ہو
گویا ضمیرِ حاضر صیغے میں مستتر ہے

اصنام آرزو کو دل سے مرے نکالو
کعبہ تھا گھر خدا کا اور یہ تمہارا گھر ہے

واصف کی لاج رکھ لی عظمت نے تیری ورنہ
کہتے جو تجھے فرشتے وہ بات معتبر ہے

ماضی اور حال

۱۹۴۹ء

رات کی محفل کا واصف کیا کہوں کیا رنگ تھا
ذرہ ذرہ عالمِ مستی میں ہم آہنگ تھا

جان و دل پر رفعتِ تخئیل کا نیرنگ تھا
یہ محیطِ ہر دو عالم راہِ یک فرسنگ تھا

عشق کے قدموں میں تھیں ہر دو جہاں کی نعمتیں
سرمدی نغموں سے میرے رقص آور چنگ تھا

ذرہ ذرہ بے محابا کر رہا تھا کسبِ نور
بے تکلف جلوہ آرا حسنِ شوخ و شنگ تھا

پتی پتی پھول کی الفت کی دستاویز تھی
ہر پرِ پروانہ لفظِ عشق کی فرہنگ تھا

دل دھڑکنے کی صدا تھی نغمۂ روح الامین
ہر شکستِ دل کا آوازہ صدائے چنگ تھا

فکرِ بیش و کم سے فارغ بے نیازِ خیر و شر
رند جو محفل میں تھا آزادِ نام و ننگ تھا

دل نہ تھا اس عقلِ سرگرداں کے پھندوں میں اسیر
وہ جنونِ سادہ رشکِ دانشِ افرنگ تھا

جرمِ عصیاں تھا مری ہستی کا اک بارِ عزیز
میں بایں تر دامنی میزان کا پاسنگ تھا

ناگہاں دیکھا کہ برہم ہے مزاجِ بزمِ عیش
اہرمن بغض و حسد کا برسرِ اورنگ تھا

باہم آویزاں تھے امن و آشتی کے مدعی
صحنِ گلشن میں ہر اک محوِ فساد و جنگ تھا

پی گئے اتنی کہ بس آپے سے باہر ہو گئے
جام و مینا کی جگہ انبارِ خشت و سنگ تھا

خاک سی اڑتی نظر آئی جدھر اٹھی نگاہ
دیدۂ عبرت نگر رنگِ جہاں پر دنگ تھا

منتشر اجزائے محفل منفعل ذوقِ نشاط
داغِ حسرت سے یہ سینہ نقشۂ ارژنگ تھا

گلشنِ خوابِ عدم کی وسعتِ رنگیں نہ پوچھ
آنکھ جب کھولی تو یہ صحرائے عالم تنگ تھا

گریۂ پیہم سے بھی واصف نہ اب تک مٹ سکا
جوہرِ تخئیل پر جو بیدلی کا زنگ تھا

مانا کہ بڑے باپ کا ہے تو فرزند
جس باپ کی کھاتا ہے زمانہ سوگند
نسبت ہے بہت بڑی مگر تو کیا ہے
"بدنام کنندۂ نکو نامے چند"

نظروں میں طرحدار کوئی جچ نہ سکا
سر میں کبھی سودائے جنوں پچ نہ سکا
اس دل کو حسینوں سے بچایا ہم نے
سائل کی نگاہوں سے مگر بچ نہ سکا

واصف

(۱)

پگھل جائے سن لے اگر سنگ خارا / سنا بھی ہے تم نے؟ فسانہ ہمارا
رہا عمر بھر میرے دل کا سہارا / دم رخصت آنکھوں سے تیرا اشارا
مرا دل جو ہے زندگی کا سہارا / کہاں ایک تنکا کہاں غم کا دھارا
نہ مرنے پہ قدرت نہ جینے کا یارا / عنایت، نوازش، کرم کردگارا!
مری اجڑی بستی پہ اک چشم رحمت / بہارِ سراپا! سراپا بہارا
نظر بھر کے مجھ کو بھی دیکھا تو ہوتا / نہ ہوتا یہ رازِ نہاں آشکارا
تمہیں یاد ہو گا وہ گزرا زمانہ / زبانوں پہ جب تھا فسانہ ہمارا
زمانے نے اب وہ کہانی بھلادی / کہ تھا ربط باہم ہمارا تمہارا
ہم آہنگ و ہمراز تھے ایسے ہم تم / نوا سنج ہوتا ہے جیسے دو تارا
وہ درپردہ سوزش وہ تمکیں بظاہر / چٹانوں میں پنہاں ہو جیسے شرارا
ستاروں نے دیکھا ہے راتوں کو اکثر / مرے نالۂ نیم شب کا نظارا
وہ ایک آخری اور آوارہ حسرت / سرِ شام جیسے افق پہ ستارا

فلک سے گلہ ہے نہ تم سے شکایت
کوئی اور تھا جس نے واصف کو مارا

(۲)

افسانہ زندگی کا سنایا نہ جا سکا / بار الم سے سر کبھی اٹھایا نہ جا سکا

وہ جلوہ طور پر جو دکھایا نہ جا سکا / آخر یہی ہوا کہ چھپایا نہ جا سکا

الفت کے خارزار سے دامن تو بچ گیا / لیکن دل زبوں کو چھڑایا نہ جا سکا

آتے ہی ان کے دشت و جبل مسکرا اٹھے / ایسے ہیں اپنا حال سنایا نہ جا سکا

گردوں بھی اضطراب عزیزاں سے ہل گیا / سوئے کچھ ایسے ہم کہ جگایا نہ جا سکا

دامن کے داغ اشک ندامت نے دھو دیئے / لیکن یہ دل کا داغ مٹایا نہ جا سکا

آنکھیں تو آج تک ہیں سوئے در اٹھی ہوئی / معذور رکھ جو پاؤں اٹھایا نہ جا سکا

کتنی گھٹائیں آئیں برس کر گزر گئیں / شعلہ ہمارے دل کا بجھایا نہ جا سکا

باتیں ہزاروں تو حریفوں کی چھپ گئیں
واصف کا راز تھا جو چھپایا نہ جا سکا

(۳)

بزم مے سے نہ اٹھا مجھ کو مری جاں تھم جا / مجھ سا کون آئے گا پھر صاحب عرفاں تھم جا

ایک لمحے کے لئے گنبد گرداں تھم جا / آخری گھونٹ ہے اے فصل بہاراں تھم جا

ناگہاں بڑھ گئی پھر کیوں مرے دل کی دھڑکن / شاید آتا ہے کوئی، عمر گریزاں! تھم جا

دل سے اک آہ جو کھینچوں تو سحر ہو جائے / مجھ کو آنکھیں نہ دکھا ظلمت زنداں تھم جا

خاک سے آتی ہے کیسی یہ کراہوں کی صدا / مجھ کو سننے دے ذرا گنبد گرداں تھم جا

ناتوانی سے خفا ہو کے نہ جا اے غم عشق / یک نفس اے مرے روٹھے ہوئے مہماں تھم جا

انھیں ذروں سے دل تازہ بنانا ہے مجھے / دل کا مدفن ہے یہ اے شورش طوفاں تھم جا

دیکھ یہ عہد گزشتہ کے نہ مٹ جائیں نقوش / منزل دوست ہے اے دیدۂ گریاں تھم جا

دل لگی سے نری جز دل کوئی مانوس نہیں / ڈھونڈھ لوں دل کو نسیم سحرستاں تھم جا

دل کی کروٹ سے بگڑ جائے نہ نظمِ افلاک — دل میں کچھ اور ذرا دید کے ارماں تھم جا
ہم سفرا دل سوزاں کو فروزاں کرلیں — جلوہ افروز ہے اب شامِ غریباں تھم جا
مسکراتی ہوئی وہ صبح چلی آتی ہے — تجھ کو سینے سے لگا لوں شبِ ہجراں تھم جا

ضبط کرو آصفِ محزوں کہ نہیں تابِ شنید
رحم کر بزم پہ اے جانِ عزیزاں تھم جا

(۴)

گرجتا گونجتا بادل سر کہسار آ پہنچا — اٹھو اے میکشو! وقت کشود کار آ پہنچا
کریں اب اہل محفل اہتمام بادہ و ساغر — پیام عیش لے کر ابر گوہر بار آ پہنچا
سنبھل او مست ناز آخر یہ غفلت کیشیاں کب تک — کہ سیل گریۂ پیہم پس دیوار آ پہنچا
جنونِ عشق کی عظمت زلیخا سے کوئی پوچھے — کہ یوسف سا پیمبر بھی سر بازار آ پہنچا
نہ دل میں یاد ماضی ہے نہ مستقبل کا اندیشہ — یہ کس منزل میں اے دل عمر کا رہوار آ پہنچا
خدا جانے کہ اب اہل نظر کا حال کیا ہوگا — تمنا جس کی تھی وہ لمحۂ دیدار آ پہنچا

خبر لے جلد تو اے دوست! اب وقت ترحم ہے
ترے در تک یہ نیم جاں آصف بیمار آ پہنچا

(۵)

شب غم رنج و حسرت میں کٹی وقت سحر آیا — نہ آئی موت ہی ظالم نہ وہ رشک قمر آیا
سر مقتل جو اس کا جلوہ غرفے میں نظر آیا — تو خود جلاد کا مجھ پر دل بے درد بھر آیا
خطا کاروں کی عظمت زاہد معصوم کیا جانے — خطا کی اور زمیں کا ین کے آدمؑ تاجور آیا
گلستاں ایک دیوانے کی آمد سے چمک اٹھا — ہنسے غنچے کہ حسن بے نشاں کا پردہ در آیا
حضور حسن کیا معلوم دل پر کیا گزرتی ہے — کہ اس محفل سے جو آیا وہ ہو کر بے خبر آیا
نظر میں گردش پیہم جلو میں شورش محشر — سنو اے کشتگان غم! کہ پھر وہ فتنہ گر آیا

سے تارِ نفس کو چھیڑا اپنے نیزِ مژگاں سے
کہ میری خوئے غم سے زخمۂ غم لے اثر آیا

کہاں ہے رہروانِ دشت کی منزل خدا جانے
پلٹ کر راہرو آیا نہ کوئی راہبر آیا

یہاں کی خاک تو کچھ آشنا معلوم ہوتی ہے
یہ کس اجڑی ہوئی بستی میں نوائے ہم سفر آیا

گزاری ہے اسی محفل میں ساری رات ہم نے بھی
نہ رکھ محروم اے ساقی! کہ ہنگامِ سحر آیا

بہ فیضِ سائلِ شیریں نوا بزمِ ادیباں میں
با ایں کم مائگی واصفؔ پئے عرضِ ہنر آیا

(۶)

کہاں سے آئے اس غربت کدے میں ترجماں میرا
کہ اک چشمِ تحیر ہے زباں میری بیاں میرا

وہی تھا ایک لمحہ حاصلِ عمرِ رواں میرا
کھلا تھا ان پہ جب رازِ محبت ناگہاں میرا

وہ کیونکر اور کس سے پوچھنے آگر مکاں میرا
کہ اک نازک سی نسبت کے سوا کیا ہے نشاں میرا

نہ کوئی سن سکا تمہید بھی افسانۂ دل کی
نہ نکلا آج تک دنیا میں کوئی رازداں میرا

کتابِ دل میں کچھ سطروں کو دہرانا بھی پڑتا ہے
کہ رنگِ حلقۂ آیت ہے اشکِ خوں چکاں میرا

بجز آہِ فسردہ کیا ہے اپنی شوق سامانی
حضورِ ساقیِ کوثر یہی ہے ارمغاں میرا

نسیمِ صبح کے جھونکے سے سینہ چاک ہو جس کا
نہیں وہ غنچۂ کم ظرف قلبِ رازداں میرا

سنا ہے گلشنِ ہستی میں پھر فصلِ بہار آئی
یہاں اب تک وہی دل ہے وہی سوزِ نہاں میرا

بس اک نخلِ تمنا ہی دلیلِ موسمِ گل ہے
یہی ہے سیرگہ میری یہی ہے گلستاں میرا

ابھی کچھ اور باقی ہیں ورق افسانۂ غم کے
کہ سرخیِ شفق ہے وقفۂ عرضِ فغاں میرا

وہ نغمہ چھیڑ اے واصفؔ کہ دل کو کچھ قرار آئے
زہے ساعت کہ آج آزاد ہے ہندوستاں میرا

(۷)

زمیں میری زماں میرا نظامِ آسماں میرا
جو ہے عزم و یقیں دل میں تو ہے سارا جہاں میرا

چمن کی وسعتِ رنگیں میں گو اب خاک اڑتی ہے
مگر اے ہم سخن پھر بھی یہیں ہے آشیاں میرا

یہ مرجھائے ہوئے پودے یہ کچھ بکھرے ہوئے تنکے
یہی میرا وطن ہے ہاں یہی ہے آشیاں میرا

ابھی کمسن ہو کیا میری وفا کو آزماؤ گے
یہاں مدت سے گردوں لے رہا ہے امتحاں میرا

نہ بڑھ حدِ ادب سے دور ہو اے دیوِ نومیدی
کہ تیری دسترس سے دور تر ہے آستاں میرا

نہ نکلی آج تک تعبیر گو خوابِ محبت کی
مگر اے دوست! جائے گا نہ سودا رائگاں میرا

ترے نغموں میں واصفؔ آج کیوں اتنی حرارت ہے،
لہو بن کر نہ بہہ جائے یہ قلبِ ناتواں میرا

(۸)

قدم یوں بے خطر ہو کر نہ میخانے میں رکھ دینا
بہت مشکل ہے جان و دل کو نذرانے میں رکھ دینا

سنا ہے حضرتِ واعظ ادھر تشریف لائیں گے
ذرا اس کاسۂ گردوں کو میخانے میں رکھ دینا

بتوں کے دل میں یوں شاید خدا کا خوف پیدا ہو
یہ میرے دل کے ٹکڑے جا کے بتخانے میں رکھ دینا

یہاں اے دل فرشتوں کا بھی زہرہ آب ہوتا ہے
قدم آساں نہیں الفت کے ویرانے میں رکھ دینا

چلا ہے گھر کو دیوانہ اڑا کر خاک صحرا کی
غبارِ خاطرِ احباب کاشانے میں رکھ دینا

زیارت کو وہ دشتِ نجد کا جانباز آئے گا
ذرا دم بھر کو میری نعش ویرانے میں رکھ دینا

بفیضِ حضرتِ ناصح ہوئی توفیق توبہ کی
مرا جامِ شکستہ ان کے شکرانے میں رکھ دینا

منافی تھا یہ اے منصور دستورِ امانت کے
کسی کی بات کو یوں اپنے بیگانے میں رکھ دینا

پلائی ہے جو واصفؔ کو مئے مرد آزما ساقی
تو کچھ شانِ خودی بھی اپنے دیوانے میں رکھ دینا

(۹)

کبھی درد آشنا تیرا بھی قلبِ شادماں ہوگا
کبھی نامِ خدا تو بھی تو اے کم سن جواں ہوگا

نہیں معلوم ان کی جلوہ گہ میں کیا سماں ہوگا
نظر جب کامراں ہوگی تو اے دل تو کہاں ہوگا

وہی اک سانس ہمدوش حیات جاوداں ہوگا | جو آہ سرد بن کر سوز غم کا ترجماں ہوگا
فضا ٹھرا رہی ہے ہر طرف حسرت سی چھائی ہے | سنا ہے آج مقتل میں کسی کا امتحاں ہوگا
لرز جائیں گے یہ مظلومیٔ دل کے تماشائی | اگر یہ خاک کا تودہ کبھی آتش فشاں ہوگا
جو سوز دل سے مضطر ہو کے آئے گا سر مژگاں | تو خورشید قیامت میرا اشک خوں چکاں ہوگا
یہ کیوں اس کے خرام ناز میں لغزش سی آئی ہے | کہیں زیر قدم مدفون کوئی بے زباں ہوگا
ستارے بن کے چمکیں گے دل برباد کے ذرے | یہ دل برباد ہو کر بھی دلیل کارواں ہوگا

غنیمت ہے کسی کا ساتھ ہونا راہِ غربت میں
کہ اس کا منتہا واصف خدا جانے کہاں ہوگا

(۱۰)

شرار شمع کو بے سوز پروانوں سے کیا ڈرنا | وقار حسن کو بے مغز دیوانوں سے کیا ڈرنا
تمہیں جیسے ہیں سب انسان انسانوں سے کیا ڈرنا | جو یہ حیوان بن جائیں تو حیوانوں سے کیا ڈرنا
جہاں موجیں ہی خود تکتی ہوں اٹھ اٹھ کر سوئے ساحل | تو پھر اے کشتی والو! ایسے طوفانوں سے کیا ڈرنا
چمکتا ہے یہاں خورشید بن کر داغ ناکامی | اسیر غم کو ان تاریک زندانوں سے کیا ڈرنا
تری موج نظر خود ہی بہار ہر دو عالم ہے | تو پھر اے باغباں اجڑے گلستانوں سے کیا ڈرنا
بقدر حوصلہ ہوتی ہے زخموں پر نمک پاشی | مذاق سوزش دل کو نمک دانوں سے کیا ڈرنا
بیابانہا بہر مشتے و صد منزل بہر گامے | جنوں کی عظمتوں کو ان بیابانوں سے کیا ڈرنا
لہو سے جس کے رنگیں سرخیٔ تاریخ عالم ہے | اسے بزم جہاں کے سرخ افسانوں سے کیا ڈرنا
جو پی کر ایک ہی جرعہ حواس و ہوش کھو بیٹھیں | بلانوش ازل کو ایسے دیوانوں سے کیا ڈرنا
سناتے ہیں بڑی حکمت کی باتیں حضرت واعظ | جو خود کو بھول جائیں ایسے فرزانوں سے کیا ڈرنا

کٹی ہے زندگی احباب کے طعنوں میں اے واصف
تو پھر اغیار کے کمزور بہتانوں سے کیا ڈرنا

(١١)

کیا کیا کرم گردش ایام ہوا تھا
جب کفر پہ قرباں مرا اسلام ہوا تھا

کیا خوب ہے اس دور محبت کا فسانہ
جب عشق سے واقف وہ گل اندام ہوا تھا

ہر بوالہوس خام بھی اب اہل نظر ہے
فیضان ترا یوں نہ کبھی عام ہوا تھا

یوں راز تری بزم کے افشا نہ ہوئے تھے
کب غیر کو یہ حوصلۂ جام ہوا تھا

پوچھو نہ اب اس لمحۂ عشرت کی کہانی
اک آہ پہ جس کا کبھی انجام ہوا تھا

وہ راز نہاں شہر میں کیوں فاش نہ ہوتا
جس راز کا اظہار سر بام ہوا تھا

ممکن ہے کہ واصف کا نشاں اس کو نہ ہو یاد
مدت ہوئی جب نامہ و پیغام ہوا تھا

(١٢)

کریں اپنے لئے ہم التجا کیا
سوالی بن کے جینے کا مزا کیا

تغافل کیا اذیت کیا جفا کیا
دیا ہے دل تو پھر ان کا گلہ کیا

گئی سوزش تو پھر دل میں رہا کیا
تپک جس میں نہ ہو وہ آبلہ کیا

جوانی بھی ہے اور حسن و ادا بھی
تجھے دوں اے ستمگر اب دعا کیا

اسی کوچے میں ساری عمر گزری
کوئی سمجھاؤ آخر ہے وفا کیا

کہاں تک سعئ پرسش ہائے پنہاں
دل بے مدعا کا مدعا کیا

جگر میں ٹیس ہونٹوں پہ تبسم
دیئے ہیں امتحاں ہم نے بھی کیا کیا

تمنائے اجل بھی بجھ رہی ہے
تمہیں سوچو کہ اب دل میں رہا کیا

خدائی کا یہ خود رکھتے ہیں دعوی
بتوں کے دل میں ہو خوف خدا کیا

شکست آرزو شرط وفا ہے
ادائے فرض کا واصف صلہ کیا

(۱۳)

نگاہ لطف کے قابل مجھے تم نے اگر جانا
تو کچھ مشکل نہیں بگڑے ہوئے دل کا سنور جانا

یہ عمر چند روزہ جس کو ہم نے مختصر جانا
بڑی فرقت میں مشکل ہو گیا اس کا گزر جانا

نہ کر تو رہنما کی فکر اے دل دشت غربت میں
مبارک ہو ترا ہر پھیر کے منزل سے گزر جانا

بہائے آنکھ سے خون دل صحرائے وحشت میں
نہیں آسان نقوش عہد ماضی کا ابھر جانا

ہوائے سرد کے جھونکوں سے دل میں ٹیس اٹھتی ہے
قیامت ہے مرے دل کے لئے زخموں کا بھر جانا

لڑکپن میں نہ سمجھے ہم کہ مرنا کس کو کہتے ہیں
جوانی نے بتایا موت سے پہلے ہی مر جانا

بگڑتا ہے یہاں ساحل تو آگے جا کے بنتا ہے
خلاف عزم ہے موجوں کی طغیانی سے ڈر جانا

پلک پر ان کی آنسو تاب عارض سے لرزتا ہے
کہ انگارے پہ ہے دشوار پارے کا ٹھہر جانا

رواں ہیں کارواں در کارواں صحرائے ہستی میں
خبر کس کو ہے اے واصف کہ آخر ہے کدھر جانا

(۱۴)

ہوئے دور مجھ سے سب اپنے پرائے قریں تم نہ ہو گے تو پھر کون ہو گا
مری آہ و زاری مرے رنج و غم پر حزیں تم نہ ہو گے تو پھر کون ہو گا

کچھ ایسا اجاڑا مرے دل کو تم نے کہ کرنے لگی آرزو بھی کنارا
اگر اپنے اجڑے ہوئے گھر میں آکر مکیں تم نہ ہو گے تو پھر کون ہو گا

سماتا نہیں میری آنکھوں میں کوئی انوکھے ہیں انداز میرے جنوں کے
حسینان عالم میں سب سے نرالے حسیں تم نہ ہو گے تو پھر کون ہو گا

مری ذلتوں پر ہیں سب ہنسنے والے نہیں کوئی میرے لئے کڑھنے والا
مصیبت پہ میری مقدر پہ میرے حزیں تم نہ ہو گے تو پھر کون ہو گا

چھپایا یگانوں سے بھی راز الفت کہ یہ تھا بھرم در حقیقت تمہارا

مرے قلب مضطر کے رازِ نہاں کے امیں تم نہ ہو گے تو پھر کون ہو گا

محبت مری ایسی سستی نہیں ہے تمھیں چاہ کر پھر بھی چاہوں کسی کو

مرے دل کے گاہک مگر تم نہیں ہو نہیں تم نہ ہو گے تو پھر کون ہو گا

جو پردہ تمھارا ہے مضبوط ایسا تو میرا تجسس بھی بودا نہیں ہے

یہاں بھی وہاں بھی اِدھر بھی اُدھر بھی کہیں تم نہ ہو گے تو پھر کون ہو گا

ہمارے ہی دم سے ہے محفل میں رونق ہمیں سے ہیں زندہ رسوم محبت

اگر ہم نہ ہوں گے تو آخر اکیلے تمھیں تم نہ ہو گے تو پھر کون ہو گا

یہ واصف تمھارا وہی تو ہے جس نے تمھیں دیکھ کر پھر کسی کو نہ دیکھا

حریم تصور میں تشریف لا کر مکیں تم نہ ہو گے تو پھر کون ہو گا

(۱۵)

دل زار و محزوں کی گہرائیوں تک رسا تم نہ ہو گے تو پھر کون ہو گا

مریض محبت کے درد جگر کی دوا تم نہ ہو گے تو پھر کون ہو گا

بگڑنا تمھارا درست اور بجا ہے بڑی منتوں سے یہ موقع ملا ہے

ذرا اپنے غصے کے تیور دکھانا خفا تم نہ ہو گے تو پھر کون ہو گا

سمجھتا ہوں میں بھی فلک کی نگاہیں ملے ہو تو آخر جدائی بھی ہو گی

تمھارے سوا کس کو اپنا بنایا جدا تم نہ ہو گے تو پھر کون ہو گا

پیامی بنا کر تمھیں بھیجتا ہوں نہ تھمنا نہ رکنا کہیں میرے نالو!

یہ مانا کہ ہیں وہ بہت دور لیکن رسا تم نہ ہو گے تو پھر کون ہو گا

خدائی بہت سے خداؤں کی دیکھی مگر یہ سلیقہ کسی میں نہ پایا

یہ چھپنے کے انداز کب ہیں کسی میں خدا تم نہ ہو گے تو پھر کون ہو گا

کچھ ایسا ہے بیار واصف تمہارا طبیبوں نے جس کا مداوا نہ پایا
نہ سمجھے کوئی جس کو ایسے مرض کی دوا تم نہ ہو گے تو پھر کون ہو گا

(۱۶)

رسم جنونِ عشق کو توڑا نہ جائے گا ظالم یہ دین وہ ہے کہ چھوڑا نہ جائے گا
شیرازہ تیری بزم کا قائم اسی سے ہے عاشق کا دل نہ توڑ کہ جوڑا نہ جائے گا
کیونکر بنے گا باعث تنظیم میکدہ انگور کا جو خوشہ نچوڑا نہ جائے گا
آہم نشیں کہ داغ کہن تازہ کر چلیں یہ رخشِ عمر ہے اسے موڑا نہ جائے گا
کب سے ہوں زور بازو قاتل کا منتظر
واصف کا سر ہے سنگ سے پھوڑا نہ جائیگا

(۱۷)

آج آنسو ان کی پلکوں پر اگر چمکا تو کیا ڈوبتے دل پر مرے نجم سحر چمکا تو کیا
اٹھ نہیں سکتے یہاں اب ناتوانی سے قدم سامنے آنکھوں کے سنگ رہگذر چمکا تو کیا
روح فرط شوق میں اب عازم پرواز ہے رفعت گردوں پہ مرغ نامہ بر چمکا تو کیا
خرمن دل جل چکا عرض تمنا کیا کروں دود آوارہ میں اڑ کر اک شرر چمکا تو کیا
گر گیا جب تیری نظروں سے تو دل کا کیا وقار خاک میں پامال ہونے پر گہر چمکا تو کیا
زیست کی تاریک راتیں کٹ گئیں تیرے بغیر اب اگر گور غریباں پر قمر چمکا تو کیا
ہے بس اک تبدیلی موسم تک صفائے آئینہ ظاہری زینت سے کوئی بے ہنر چمکا تو کیا
اس چراغاں کا تماشا دیکھنے آتا ہے کون شام تنہائی میں یہ داغ جگر چمکا تو کیا
یاس پر قربان واصف کی جوانی ہو گئی
اختر امید ہنگام سحر چمکا تو کیا

(۱۸)

یہ کس کا نور چمکا ہے سر کہسار کیا کہنا
کہ ہے ہیرا تخیل مطلع انوار کیا کہنا

کسی کے عشق کا یہ مستقل آزار کیا کہنا
مبارک ہو دل محزوں ترا ایثار کیا کہنا

یہ میری عمر بھر کی حسرت دیدار کیا کہنا
وہ آخر جلوہ ریزی سے ترا انکار کیا کہنا

نہ کرتے التجا دیدار کی موسیٰؑ تو کیا کرتے
چلا آتا ہے کب سے وعدۂ دیدار کیا کہنا

وہی کرتا ہوں جو کچھ لکھ چکے میرے مقدر میں
مگر پھر بھی ہوں اپنے فعل کا مختار کیا کہنا

قدم اٹھتے ہی دل پر اک قیامت بن جاتی ہے
دم گلگشت اس کی شوخیٔ رفتار کیا کہنا

شب ہجراں یہ میری رشک آتا ہے ستاروں کو
بھرم تجھ سے ہے میرا دیدۂ بیدار کیا کہنا

نگاہ خشمگیں سے آج اس نے مجھ کو دیکھا ہے
دل مجبور اور یہ فتنۂ تاتار کیا کہنا

ترے نغموں سے واصف اہل دل مسرور ہوتے ہیں
با ایں افسردگی رنگینیٔ گفتار کیا کہنا

(۱۹)

رخ اپنا بدل لیتا دریا کا دھارا مگر کاش تیرا سہارا تو ہوتا
مرے ڈوبتے دل کو ملتا کنارا ذرا تو نے دل کو ابھارا تو ہوتا

تغافل کا شکوہ زباں پر نہ لاتے جو گزری تھی ہم پر اسے بھول جاتے
کرم اتنا ہوتا وہ مقتل میں آتے دم آخر ان کا نظارا تو ہوتا

یہ مانا کہ خواب عدم ہے میسر یہ تسلیم تجھ سے ہوں غافل سراسر
مگر میرے مرقد کے نزدیک آکر کبھی تو نے مجھ کو پکارا تو ہوتا

ادب کا ہے معلوم ہم کو قرینہ خلاف ادب تھا طلب کر کے پینا
اٹھا لیتے ہم بڑھ کے خود جام و مینا مگر تیرا کوئی اشارا تو ہوتا

مرا دل زمانے سے زیر و زبر ہے تجھے کیا بتاؤں یہ تیرا ہی گھر ہے

بڑے امن و راحت کا یہ مستقر ہے مرے دل کو تو نے سنوارا تو ہوتا

یہ مانا کہ میری وفا کچھ نہیں ہے وفاؤں کا میری صلہ کچھ نہیں ہے

کرم تیرا غیروں پہ کیا کچھ نہیں ہے جلایا نہ مجھ کو تو مارا تو ہوتا

کھلا دل لگاتے ہی احوال الفت چھپائے سے چھپتی نہیں ہے محبت

مگر تم کو واصف سے کیوں ہے شکایت بالآخر یہ راز آشکارا تو ہوتا

(۲۰)

جو کچھ ملا تھا ہم کو وہ سب ہم نے کھو دیا
اس عشق نے تو ہم کو سراسر ڈبو دیا

لعل و گہر کا ہار بنایا ترے لئے
دل کو بھی ہم نے تار نظر میں پرو دیا

پوچھا تھا چارہ گر نے سبب اضطراب کا
کچھ سوچ کر مرا دل مظلوم رو دیا

تیر نظر سے نکلے تو شاید نکل سکے
کانٹا جو غم نے میرے جگر میں چبھو دیا

وقت دعا جب آنکھ میں آنسو نہیں رہے
پلکوں کو میری خون جگر نے بھگو دیا

کیا کھل سکے گا غنچۂ امید ہم نشیں!
قسمت نے تخم یاس مرے دل میں بو دیا

اہل قفس کو آتش گل کا تھا انتظار
شبنم نے آکے سارے چمن کو بھگو دیا

اب تو یہ آرزو ہے کہ انجام ہو بخیر
میرے لئے بہت ہے وہی تو نے جو دیا

دنیا نے کی نہ اک دل بے مدعا کی قدر
واصف کو اپنے ہاتھ سے انہوں نے کھو دیا

(۲۱)

یہ خمسۂ سود و زیاں یاد رہے گا
کیا خوب ہے یہ رنگ جہاں یاد رہے گا

بربادئ گلشن کا سماں یاد رہے گا
دیکھا ہے جو یہ عہد خزاں یاد رہے گا

بیچارگئ دل کا سماں یاد رہے گا
یہ معرکۂ تیر و سناں یاد رہے گا

ہم بھول تو جائیں گے وہ تیور ترے اے دوست
سینے میں جو اٹھا تھا دھواں یاد رہے گا

دل ہل گئے محفل کے کچھ اس درد سے رویا
اے دل ترا اندازِ فغاں یاد رہے گا

اس وعدۂ مبہم سے تسلی نہیں ہوتی
اک بار تو کہہ جاؤ کہ ہاں یاد رہے گا

سوزِ دلِ محروم کی کیا ہوگی تلافی
یہ قصۂ غم تم کو کہاں یاد رہے گا

واعظ کا بھرم کھل گیا اک رطلِ گراں سے
واعظ کو بھی یہ رطلِ گراں یاد رہے گا

دیکھے ہیں تماشے بہت اس عمر میں لیکن
رسوائیٔ واصفؔ کا سماں یاد رہے گا

(۲۲)

زیست کو پُر کیف کرنے کا قرینہ آگیا
موت سے آنکھیں ملا کر ہم کو جینا آگیا

ہنس رہے تھے پھول میرے گریۂ معصوم پر
ناگہاں بادِ بہاری کو پسینہ آگیا

مضطرب ہو کر یہ دل آ ہی گیا ان کے حضور
سنگ سے فریاد کرنے آبگینہ آگیا

آج بھی پیشِ نظر گرداب ہے طوفان ہے
ہم تو سمجھے تھے کہ ساحل پر سفینہ آگیا

آزمائش سے ہوا کرتی ہے تکمیلِ یقیں
مژدہ باد اے دل کہ طوفاں میں سفینہ آگیا

کیوں یکایک میرے پہلو سے اڑا جاتا ہے دل
دیکھنا اے چارہ سازو! کیا مدینہ آگیا

ہیں غنیمت زیست کے لمحے جو باقی ہیں ابھی
سر اٹھا واصفؔ کہ عہدِ جام و مینا آگیا

(۲۳)

تمہارے غم نے شگوفے کھلائے ہیں کیا کیا
فریب ہم نے محبت میں کھائے ہیں کیا کیا

مزے سوال کے ہم نے اٹھائے ہیں کیا کیا
خدا کے بندوں نے تیور چڑھائے ہیں کیا کیا

وہ جن کی لو سے ہزاروں چراغ جلتے تھے
چراغ بادِ فنا نے بجھائے ہیں کیا کیا

کوئی سوار بھٹک کر ادھر بھی آجائے
دیے امید کے ہم نے جلائے ہیں کیا کیا

نہ تابِ دید نہ بے دیکھے چین ہی آئے
ہمارے حال پہ وہ مسکرائے ہیں کیا کیا

کمال یاس سے آنکھوں میں اشک بھی نہ رہے
وگرنہ ہم نے خزانے لٹائے ہیں کیا کیا

رضا و صبر و قناعت تواضع و تسلیم
فلک نے ہم کو خصائل سکھائے ہیں کیا کیا

لرز گیا ہے جہاں دستِ کاتبِ تقدیر
ہماری زیست میں لمحات آئے ہیں کیا کیا

نقاب اٹھاؤ تو قصہ ہی ختم ہو جائے
تمہارے پردے نے فتنے اٹھائے ہیں کیا کیا

زمانہ ہلکا سا خاکہ نہ لے سکا جن کا
نقوش دست قضا نے مٹائے ہیں کیا کیا

یہ پنچ شیل یہ جمہوریت یہ رائے عوام
یہ اہل زر نے کھلونے بنائے ہیں کیا کیا

مری بلندیٔ ہمت کو بس خدا رکھے
فلک نے راہ میں کانٹے بچھائے ہیں کیا کیا

بلائے جاں ہوئی واصف کی بے گناہی بھی
ذرا سی بات میں الزام آئے ہیں کیا کیا

(۲۴)

پئے جلوہ محفل سجائی گئی ہے کیا جائے گا درد دل کا مداوا
مری بھی خودی آزمائی گئی ہے سنا ہے کہ آئے گا میرا بلاوا

یکایک مرا دل تڑپنے لگا ہے مری عافیت پر کیا کس نے دھاوا
دکھا کر جھلک کون غائب ہوا ہے یہ برق طپاں تھی پری یا چھلاوا

جواب ان کا مدت سے آیا نہیں ہے دغا دے گیا طائر نامہ بر بھی
دکھاتا ہے اپنی جھلک آسماں پر مگر دور سے کاٹ جاتا ہے ناوا

نہ دیکھو حقارت سے اہل وفا کو نہیں ہے بقا حسن و ناز و ادا کو
سمجھ لو کہ بھاتا نہیں ہے خدا کو غرور و تکبر تصنع دکھاوا

رقیبوں نے جو کچھ کہا ہو بھلا دو جو ہو بدگمانی تو دل سے مٹا دو
ذرا سامنے آ کے صورت دکھا دو تمنا نہیں کوئی اس کے علاوہ

محبت نے کیا کیا ہمیں آزمایا بتوں نے ہمارا تماشا بنایا

ادھر اک نے ماتھے پہ صندل لگایا کلائی پہ باندھا کسی نے کلاوا

جو بولے کبھی وہ تو آنکھیں دکھائے خفا ہو تو اپنوں کے دل کو چبا گئے

مگر اب تو ہم دل اُسے دے ہی آئے بایں خلق مذموم و گفتار یاوہ

یہ صحرائے وحشت بڑا پر خطر ہے قدم رکھ اگر دل میں تاب ضرر ہے

بھروسا نہ کر اس پہ جو ہم سفر ہے ہٹیں گے یہ سب تجھ کو دے کر بڑھاوا

عجب فتنہ ساقی نے شب کو اٹھایا بھری بزم میں سیکڑوں کو لڑایا

ادھر اک کو اکسا کے آگے بڑھایا ادھر سے دبا دوسرے کو چڑھاوا

مزہ عشق میں ہے نہ سجدے میں لذت شب و روز ہے فکر و تشویش و محنت

مری زندگی اب تو ہے وجہ زحمت گناہوں کا یا رب بہت ہے لداوا

بنے پھرتے ہیں یہ جو با زیب و زینت سمجھتے ہیں لوگ ان کو پابند سنت

بڑے میسنے اور معصوم صورت تامل سے دیکھا تو نکلا دکھاوا

زباں پر ہے اخلاق و انکساری مگر ہیں وقار و تحمل سے عاری

ذرا سا جواب ان پہ ہوتا ہے بھاری غضبناک ہو کر اگلتے ہیں لاوا

یہ دنیا محبت کے قابل نہیں ہے یہاں دل لگانے کا حاصل نہیں ہے

نہ ٹھیرو بیاباں کوئی منزل نہیں ہے وہ ٹوٹے میں ہے جس نے کھولا کجاوہ

طبیعت پہ ایسی ہے وحشت سی طاری کہ بنتی نہیں ہے کسی سے ہماری

بس اب تو ہے ساقی کی خدمت گزاری اسی کا ہے در اپنا ملجا و ماویٰ

زمانے سے واصف نگاہیں چرا لو بہت ہے اگر اپنی عزت بچا لو

کوئی بات ہرگز نہ مونھ سے نکالو کہ بگڑا ہوا ہے یہ آوے کا آوہ

(۲۵)

کیا کریں گے ترے دمساز مداوا تیرا کیا ہے چارہ مرے دل غم کے علاوہ تیرا

کچھ شکستہ در و دیوار کچھ اجڑے سے چمن
کشورِ دل پہ ہے بے سود یہ دھاوا تیرا

ان رقیبوں کی شرارت سے ہوئے ہم پہ ستم
کیا اٹھائیں گے یہ محشر میں لداوا تیرا

شکوۂ دوست نہیں اہلِ وفا کا شیوہ
کون ہے اس کے سوا ملجا و ماوی تیرا

شوق ہو دل میں ترے اور زباں پر لبیک
بزمِ قاتل سے اگر آئے بلاوا تیرا

تجھ سے کچھ بیر نہیں ہم کو گر اے واعظ
کھل رہا ہے یہ تصنع یہ دکھاوا تیرا

فکر کر واصفؔ ناداں کہ خطر ہے در پیش
جھک گیا بارِ معاصی سے کجاوہ تیرا

(۲۶)

ناگہاں موجِ نظر سے آج دل ٹکرا گیا
مژدہ باد اے رہروِ طوفاں کہ ساحل آ گیا

ساغرِ دل کو وہ مستِ فتنہ گر چھلکا گیا
رخصت اے تمکین کہ اشکوں میں تلاطم آ گیا

یہ روانی عمر کی ہے یا دوشِ ماحول کی
کیا بتاؤں کب چلا میں اور کہاں تک آ گیا

ہے خزاں بھی کیف آگیں دل اگر مسرور ہے
فصلِ گل بھی بے مزہ ہے دل اگر مرجھا گیا

کچھ نہ تھا دل میں مرے اندوہِ حرماں کے سوا
آہ یہ ویرانہ تجھ کو اس قدر کیوں بھا گیا

باوفا ثابت ہوا اس بے مروت کا خیال
بے تکلف آ گیا خلوت میں دل بہلا گیا

عمر بھر جس کو ترس آیا نہ میرے حال پہ
کیا ہوا اک دن اگر تربت پہ وہ پچھتا گیا

تنگ چشم و تنگ دل محسن کش و ناحق شناس
اب تو اس دنیا سے یارب دل بہت گھبرا گیا

کب کھلا یہ غنچۂ دل جب سے تم رخصت ہوئے
اس چمن پر ابر کتنی بار شبنم برسا گیا

کیا بہار اور کیا خزاں واصفؔ نظر کا کھیل ہے
لی جہاں انگڑائی دل نے موسمِ گل آ گیا

(۲۷)

باغِ جاں سے دل کو اکھیڑا نہ جا سکا
مر کے بھی پاؤں کو سکیڑا نہ جا سکا

مدت سے آرزو تھی کہ وہ راہ میں ملے
بارے ملا تو راہ میں چھیڑا نہ جا سکا

مر مر کے زندہ ہوتے ہیں وابستگانِ عشق
ہنگامہ عاشقی کا بکھیڑا نہ جا سکا

سمجھے تھے مر کے چھوٹیں گے قیدِ الم سے ہم
امید و بیم کا یہ بکھیڑا نہ جا سکا

واصفؔ وہ طعنہ زن ہیں گریباں کو دیکھ کر
بے طاقتی سے بخیہ ادھیڑا نہ جا سکا

(۲۸)

(ترجمہ غزلِ صائبؔ)

یاد ہیں وہ دن کہ ہم تم جب تھے باہم آشنا
ہم جلیس و ہم صفیر و ہم خیال و ہم نوا

اتحاد و ربط میں اک شعر کے معنی تھے ہم
گو الگ دو مصرعوں کی طرح تھے ہم بظاہرا

صورتِ خامہ ہماری بات بھی ہوتی تھی ایک
گو بظاہر دیکھتے ہیں دو زبانیں تھیں جدا

جیسے وہ دو پتیاں جو ایک دانے سے اگیں
یکدلی سے ہم نے پائی ساتھ ہی نشو و نما

اخترِ قسمت تھا روشن تھی مبارک زندگی
سایہ افگن ہم پہ تھا یمن و سعادت کا ہما

دوریٔ منزل ہمارے ربط میں حائل نہ تھی
ہم جہاں ہوتے خبر آپس میں رکھتے تھے سدا

چارہ گر کو ہم نے اے صائبؔ کبھی زحمت نہ دی
خود ہی بن جاتے تھے ہم دکھ درد کی اپنے دوا

اہلِ دل نے کر لیا محسوس تیرا سوز و ساز
جو کہا صائبؔ نے وہ واصفؔ کے دل کی ہے صدا

(۲۹)

خبر کیا تھی کہ اک یہ لمحۂ مشکل بھی آئے گا
سنا ہے آج اس مقتل میں وہ قاتل بھی آئے گا

وہ جس کی جستجوئے دید میں پتھرا گئیں آنکھیں
نظر کے سامنے اک دن سرِ محفل بھی آئے گا

یہ کیا شکوہ ہے کوئی چاہنے والا نہیں ملتا
کرم پر تم جو ہو مائل کوئی سائل بھی آئے گا

یہ طوفاں خیز موجیں یہ تھپیڑے باد و باراں کے
سفینے کو یونہیں کھینے رہو ساحل بھی آئے گا

نہ ہو مایوس ہمدم پاؤں میں لغزش نہ آجائے — نظر کچھ دور چل کر جادۂ منزل بھی آئے گا
محبت اپنے دیوانوں کو ویراں رکھ نہیں سکتی — کسی کی جستجو میں ایک دن محمل بھی آئے گا

یہ محفل آج نااہلوں سے جو معمور ہے واصف
اسی محفل میں کوئی جوہر قابل بھی آئے گا

(۳۰)

قصور کوئی بتاؤ اگر ہمارا تھا — یقین ہے کہ کسی نے تمھیں ابھارا تھا
جب آئے وہ تو مجھے ہوش تھا نہ یارا تھا — زباں سے کہہ نہ سکا میں کہ کس نے مارا تھا
تری نگاہ سے کیا کیا ہوا ہے دل رقصاں — وہ گویا برق کی روشنی یہ جیسے پارا تھا
یہ کس نے خواب عدم سے جگا دیا مجھ کو — قریب آکے یہ کس نے مجھے پکارا تھا
خدا ہی جانے مراحل یہ طے ہوئے کیونکر — تمھارا نام ہی دل کا مرے سہارا تھا
قفس سے حسرت تعمیر لے کے نکلے ہم — بڑا زمانہ اسی فکر میں گزارا تھا
مگر نگاہیں یہاں دیکھیں سب کی قہر آلود — دلوں کا کھوٹ جبینوں سے آشکارا تھا
زباں خموش نظر منفعل دل افسردہ — کہ ہم نشینوں کے پہلو میں سنگ خارا تھا
کمال سنگدلی سے بجھا دیا تم نے — دلوں میں عزم محبت کا جو شرارا تھا
ذرا سی دیر میں تم نے کیا چمن کو خراب — ہمارے شوق نے برسوں جسے سنوارا تھا
گواہ سب تھے انھیں کے رفیق روز جزا — ہمارا شاہد عادل سحر کا تارا تھا
دل غیور کی مجبوریاں معاذاللہ — نہ ہو سکے جو گوارا وہ سب گوارا تھا

یہ کس مجاہد الفت کا تم نے خون کیا
گناہگار تھا واصف مگر تمھارا تھا

(۳۱)

اگر خوئے تحمل ہو تو کوئی غم نہیں ہوتا — گلے شکوے سے رنج زندگی کچھ کم نہیں ہوتا

بجھی جاتی ہیں شمعیں رہگزار زندگانی کی
چراغ آرزو لیکن کبھی مدھم نہیں ہوتا

خدا کے سامنے جو سر یقیں کے ساتھ جھک جائے
کسی طاقت کے آگے پھر کبھی وہ خم نہیں ہوتا

عطا کی ہے خدا نے علم کی دولت اگر تجھ کو
سخاوت کر سخاوت، یہ خزانہ کم نہیں ہوتا

سیاست جزو ایماں ہے چلو یوں ہی سہی لیکن
کوئی مرشد مزاج وقت کا محرم نہیں ہوتا

عروج پیکر خاکی سے ہے انسانیت لرزاں
فساد و سرکشی سے پاک یہ عالم نہیں ہوتا

سنو آزادیٔ انساں کا ڈھونگ رچانے والو!
ہر اک انسان وجہ عظمت آدم نہیں ہوتا

بقدر ظرف و ہمت ہے رسائی فکر انساں کی
ہر اک عامی رموز ملک کا محرم نہیں ہوتا

تمہاری مسکراہٹ ہی مرے زخموں کا درماں ہے
مرا زخم جگر شرمندۂ مرہم نہیں ہوتا

ذرا دیکھو مرے ٹوٹے ہوئے دل کی سمائی کو
تمہاری تلخ گوئی سے کبھی برہم نہیں ہوتا

نگاہِ اولیں ہی کام اپنا کر گئی واصف
نہ ہوتا ان کا کرم مجھ پہ اگر پیہم نہیں ہوتا

(۳۲)

مرے دل پہ اک کوہِ اندوہ و غم ہے اگر جان لیتا وہ دلدار اتنا
پسند اس کے دل کو بھی شاید نہ ہوتا مری جان مجبور پہ بار اتنا

نہ دیکھا جفاکار و عیار تجھ سا جہاں میں نہیں کوئی خونخوار اتنا
مگر یہ معما سمجھ میں نہ آیا کہ پھر مجھ کو ہے تجھ سے کیوں پیار اتنا

دیا تھا کسی کو بڑے شوق سے دل کلی کی طرح اس نے پھینکا مسل کر
نہ سمجھے تھے ہم اس در بے بہا کو کہ اس کی نظر میں ہے بے کار اتنا

ستم تم نے کوئی نہ رکھا اٹھا کر مگر مجھ کو تم سے نہیں کوئی رنجش
ذرا میں بھی دیکھوں زمانے میں کوئی اگر ہو تمہارا وفادار اتنا

یہ پہلے سے تھا عزم صادق ہمارا ہر اک رنج و سختی کریں گے گوارا
نہ تھا ہم کو اندازہ لیکن تمھارا کہ پہنچاؤ گے ہم کو آزار اتنا

دل و جان و ایمان و تمکین و عزت لٹایا تری راہ میں ہم نے کیا کیا
مگر تیرے منھ سے کبھی یہ نہ نکلا کہ بس تیرا کافی ہے ایثار اتنا

بتوں کی خدائی بھی تسلیم کر لی مگر صنع خالق کا انکار مشکل
تمھارا حرج کیا ہے اے رہنماؤ! جو رہ جائے ایمان و اقرار اتنا

نہ اٹھے مرا سر جو قدموں پہ رکھ دوں نہ ہو کچھ غرض مجھ کو پھر دو جہاں سے
تمنا ہے کب سے یہی میرے دل میں میسر ہو بس مجھ کو دیدار اتنا

خدا جانے گزرا ہے کتنا زمانہ تمھاری توجہ کا میں منتظر ہوں
یہ کس کو خبر تھی کہ ہوگا یہ وقفہ کٹھن اور دراز اور دشوار اتنا

مرا حال جو کچھ ہے تم جانتے ہو نہ دو بات کرنے کی اب مجھ کو زحمت
گلہ کیا ہے اب تو دعا بھی ہے مشکل نہیں مجھ کو یارائے گفتار اتنا

یہ دنیا ہے بے فیض و خود کام واصف یہ مانا کہ وحشت میں ہے عافیت بھی
مناسب نہیں ہے مگر آدمی کو کہ ہو جائے خلقت سے بیزار اتنا

(۳۲)

قلب بریاں دیدۂ حیراں لے کر ہی گیا
مغفرت کا اپنی میں ساماں لے کر ہی گیا

جائے محرومی نہیں اے حاضرانِ بارگاہ
جو بھی آیا عفو کا فرمان لے کر ہی گیا

آج رخصت ہو گیا دنیا سے اک بیمار غم
درد ایسا دل میں اٹھا جان لے کر ہی گیا

کب نکل سکتا تھا میرے سر سے یہ سودائے عشق
درد سر بھی تیغ کا احسان لے کر ہی گیا

غم یہاں کا یا وہاں کا اپنا اپنا ہے نصیب
کچھ نہ کچھ دنیا سے غم انسان لے کر ہی گیا

حسن صنعت پر رہی عشق بتاں میں بھی نظر
میں سلامت اپنا کچھ ایمان لے کر ہی گیا

اللہ اللہ کس قدر محکم رہا تیرا حجاب
نیر او اصف دید کا ارمان لے کر ہی گیا

(۳۴)

ہر قدم پر میرے سجدے کا نشاں بنتا گیا — اس کا ہر نقش کف پا جاوداں بنتا گیا
نغمہ ساز دل سے جو چھیڑا افغاں بنتا گیا — راز میرا داستاں در داستاں بنتا گیا
کیا گلہ ہے آسماں کا اے شہیدانِ ستم — کچھ دھوئیں اٹھتے گئے اور آسماں بنتا گیا
تھی خرابی ہیں ہی پوشیدہ مری تعمیر بھی — بجلیاں گرتی گئیں اور آشیاں بنتا گیا
بارہا میری لحد کی خاک اڑائی دہر نے — دل کے ہر ذرے سے اک تازہ جہاں بنتا گیا
دیکھیے پہنچے کہاں تک میرے غم کا ماجرا — راہرو جو بھی ملا وہ رازداں بنتا گیا
آتش گل اشک شبنم داغ لالہ دود آہ — منخد ہوتے گئے اور گلستاں بنتا گیا
کیا ہی مردم خیز تھی خاک جہان آباد بھی — جو فنا ہوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

واصفِ افسردہ دل کی خوشنوائی اب کہاں
جس قدر ٹوٹے مصائب بے زباں بنتا گیا

(۳۵)

رخصت ہوئے ارباب وفا چھٹ گیا میلا — میں رہ گیا تلوار کی مانند اکیلا
بدلی سی نظر آتی ہیں قاصد کی نگاہیں — لو اور لگا جان کو میری یہ جھمیلا
ہیں اہل نظر کے لئے قدرت کی یہ آیات — چنپا ہے چنبیلی ہے کہیں موتیا بیلا
وہ شان کریمی ہے کہ رہتا نہیں محروم — اللہ کا بندہ ہو کہ شیطان کا چیلا
کیا جانے کوئی دل پہ گزر جاتی ہے کیا کیا — عزت ہے بہت اور نہیں جیب میں دھیلا
ڈوبا ہی رہا خون تمنا میں مرا دل — اف کیا کہوں اس زیست کو کس طرح دھکیلا
امید کرم سفلۂ زردار سے بے سود — کیوں تلخ نہ ہو نیم چڑھا ہو جو کریلا

ساتھی نہ کوئی راہنما تھا مرے ہمراہ
منزل پہ بھی تقدیر سے پہنچا ہوں اکیلا

جب تم پہ پڑے گی تو ہمیں یاد کرو گے
کس صبر سے ہم نے ہر اک آزار کو جھیلا

سب ایک ہی جنبش میں نکل جائیں گے کس بل
آفات و حوادث کا جو آیا ہمیں ریلا

واصف یہی اجڑا سا چمن میرا وطن ہے
چلنا یہیں سیکھا ہے اسی خاک میں کھیلا

(۳۶)

بیمارِ غم کچھ ایسا یکایک بکھر گیا
سب رو دیئے طبیب کا چہرہ اتر گیا

کب تک میں ناخدا کے سہارے جیا کروں
پانی تو اے خدا مرے سر سے گزر گیا

باقی ہے کتنا اہلِ وفا کا اب امتحاں
مدت ہوئی ستم کا سفینہ تو بھر گیا

بیشک وہ راست باز ہے لیکن ہمارے ساتھ
اکثر یہی ہوا کہ کہا اور مکر گیا

یادش بخیر درگہِ پیرِ مغاں کا فیض
خدمت میں اس کی اپنا مقدر سنور گیا

ہوش و حواس کھوئے غمِ روزگار نے
واحسرتا! زمانۂ فکر و نظر گیا

کیا پوچھتے ہو منزلِ محبوبۂ بہار
جھونکا تھا اک صبا کا چمن سے گزر گیا

مرنے پہ میرے آپ نہ آنسو بہائیے
اچھا ہوا جہان سے اک بے ہنر گیا

واصف کو اہلِ دہر نے کیا کیا کیا ذلیل
لیکن جو کام تھا اسے کرنا وہ کر گیا

(۳۷)

اگر محمل کی جانب رخ کرے بادِ سحر اپنا
نہیں جز آہ اب کوئی پیامِ مختصر اپنا

دعائیں بے اثر کمزور نالے نارسا آہیں
بسا حسرت کہ اب کس کو بناؤں راہبر اپنا

نہ گھبراؤ کہ تھوڑی دیر کی ہے تابِ گویائی
ذرا ٹھہرو کہ ہوتا ہے فسانہ مختصر اپنا

مرے سر پھوڑنے کو موجِ بوئے گل ہی کافی ہے
نہیں جوشِ جنوں وابستۂ دیوار و در اپنا

بتاؤں کیا تجھے واصف کہاں ہوں کس طرح ہوں میں
نہیں ملتا نشاں خود مجھ کو تا حد نظر اپنا

(۳۸)

افسانۂ محبت انجام تک نہ پہنچا — محفل میں ان کی میرا پیغام تک نہ پہنچا
سارا جہاں ڈبویا رو رو کے چشم تر نے — طوفانِ جوشِ گریہ اس بام تک نہ پہنچا
دن چلتے چلتے گزرا بیتے گی رات کیونکر — منزل پہ یہ مسافر گر شام تک نہ پہنچا
بالیں پہ جب وہ آئے تاب سخن کہاں تھی — اک حرف مرحبا بھی اتمام تک نہ پہنچا

آغاز زندگی سے جھیلا غم محبت
بعد فنا بھی واصف انجام تک نہ پہنچا

(۳۹)

سر محفل نقاب رخ اٹھایا جا نہیں سکتا — تماشا دل کا آنکھوں کو دکھایا جا نہیں سکتا
دکھاؤں ہم نشیں کیونکر درخشاں داغ سینے کے — کہ ہاتھ اب تو گریباں تک اٹھایا جا نہیں سکتا
یہ آغاز جوانی ہے یہ انجام محبت ہے — کہ سر زانو سے اب بیروں اٹھایا جا نہیں سکتا
یہ مانا صفحۂ ہستی سے تم مجھ کو مٹا دو گے — مگر یہ داغ رسوائی مٹایا جا نہیں سکتا
نگاہِ واپسیں سے عمر بھر کا ماجرا سن لو — کہ یہ افسانہ لفظوں میں سنایا جا نہیں سکتا
ہوائے منزل لیلیٰ نے بیخود کر دیا اتنا — قدم بھی اب سوئے منزل اٹھایا جا نہیں سکتا

چھپایا عمر بھر جس راز کو وہ آج کھلنا ہے
کہ بار زیست اب واصف اٹھایا جا نہیں سکتا

(۴۰)

تجھ پہ نثار چشم و دل رخ سے نقاب اٹھائے جا — آنکھ پہ بھی نگاہ رکھ دل کو بھی آزمائے جا
دل کہیں میرا بجھ نہ جائے دل کو مرے جلائے جا — بجھ گیا دل تو زیست کیا یونہی مجھے جلائے جا

تلخ سے تلخ لائے جا جام و سبو لنڈھائے جا — میں تجھے آزما چکا تو مجھے آزمائے جا
زیست سے بڑھ کے اور کیا زیست میں ہوگا امتحاں — جتنا بھی تجھ سے ہو سکے یونہیں مجھے ستائے جا
غم سے جو آشنا نہ ہو جینے کا اس کو حق نہیں — چاہے جو لطف زندگی سختیٔ غم اٹھائے جا
دیکھ یہ راہ عشق ہے آئے نہ چہرے پر شکن — کانٹے چبھیں تو غم نہ کر آگے قدم بڑھائے جا

واصف مضطرب انھیں رہنے بھی دے حجاب میں
بزم خیال میں مگر شمع وفا جلائے جا

(۴۱)

کس طرح غم کو چھپائے دل آزار طلب — سر مژگاں کوئی منصور ہے پھر دار طلب
عمر بھر نم ہی رہا دیدۂ دیدار طلب — کس قدر ان کی ملاقات ہے دشوار طلب
کفر و ایمان کی تفریق ہے دشوار طلب — ہے یہاں دانۂ تسبیح بھی زنار طلب
آج پھر سینے میں رہ رہ کے دھواں اٹھتا ہے — پھر کوئی حسرت مجبور ہے اظہار طلب
آبرو دل کی ترے ہاتھ ہے اے ذوق جنوں — ذرہ ذرہ رہ وحشت کا ہے ایثار طلب
شرم رکھ لے مری بیچارگیٔ حسرت کی — میں نے تجھ سے ہی کیا ہے تجھے ناچار طلب
ہو سکے تم سے تو فریاد و دعا کی زحمت — کہ دوا کی نہیں رکھتا دل بیمار طلب
آزمائش گہ غم میں دل نازک کو نہ لا — کہ زر گل نہیں ہوتا کبھی معیار طلب
کاش اک بار تو سنتے وہ کہانی میری — قصۂ عمر دو روزہ نہیں تکرار طلب

ہے گنہ گار مگر تیرا گدا ہے واصف
تیرا دامانِ شفاعت ہے گنہگار طلب

(۴۲)

دو گھڑی کا اور ہے بیمار اب — ہو رہا ہے وصل کا اقرار اب
تا بکے افسردگیٔ انتظار — بس بسر ہو چکا دیدار اب

ہیں فرشتے جس کی عظمت کے گواہ ہے وہی انساں ذلیل و خوار اب

چرخ نے طوفاں وہ برپا کیا عشق کا بھی سرد ہے بازار اب

اب کہاں وہ جذبۂ عیش و نشاط زندگی سے جان ہے بیزار اب

ہم نہ کہتے تھے کہ یوں ان کو نہ دیکھ خوب رو اے دیدۂ خونبار اب

عیش میں ہم خود سے بھی غافل رہے ہے خدا کے نام کی تکرار اب

ماجرائے ضبط واصف کچھ نہ پوچھ
مضمحل ہے طاقتِ گفتار اب

(۴۳)

کیا پوچھتے ہو مجھ سے مری بیدلی کی بات دل پر گراں گزرتی ہے اب تو خوشی کی بات

اعراض دید بھی ہے ادھر اس طرف نیاز کیونکر چھپی رہے سرِ محفل کسی کی بات

باقی نہ کوئی وار نہ حاضر دل و جگر ہے اور میرے دوست مری زندگی کی بات

صحنِ چمن میں روئی ہے شبنم بھی رات بھر پہنچی ہے کتنی دور مری بیکسی کی بات

فریاد کس سے کیجئے اور کس امید پر پوچھی نہ آج تک کبھی اس نے کسی کی بات

یہ بزمِ ناز ہے کوئی بزمِ سخن نہیں اونچی رہے گی اب تو یہاں مدعی کی بات

واصف گئے جہان سے اربابِ آگہی
اب جائیں کس سے پوچھنے ہم آگہی کی بات

(۴۴)

اے وہ کہ اقتدار نے تجھ کو کیا ہے مست کیا یاد اب نہیں ہے تجھے وعدۂ الست

رکھتا ہے تو زبان پہ جاری خدا کا نام دیکھا جو غور سے تو بباطن ہے خود پرست

عالی نسب ہے عالم و مفتی ہے تونگر کھوٹی نیت ہے تنگ طبیعت نگاہ پست

ہے جانماز تک ہی ترا زہد و اتقا اُف کیسا مسمسا ہے خدادانِ خود پرست

کوتاہ کس قدر ہے یہ ملکِ عدم کی راہ — مژگاں کی اک جھپک ہے نفس کی بس ایک جست
ہاں تیرے ہاتھ تک نہیں سکتا مرا ضمیر — قسمت نے گرچہ مجھ کو بنایا ہے تنگ دست
آتا نہیں سمجھ میں ترا مدعا ہے کیا — بندے کے ہاتھ میں نہیں قسمت کا بند و بست

غافل مباش از دلِ یاس آشنائے من
این قطرہ از گداز دو عالم چکیدہ است
(بیدل)

(۴۵)

کیونکر کروں اب تازہ محبت کی روایات — گم ہو گئے لیلیٰ کے منازل کے نشانات
کہتے ہیں سرِ راہ مناسب نہیں ملنا — کیا خوب کہ اب ہو گی کہیں اور ملاقات
ہلکی سی خلش دل میں لگا ہوں میں اُداسی — شاید یونہیں ہوتی ہے محبت کی شروعات
ٹوٹے ہوئے تارے میں نہیں کوئی تجلی — پلکوں سے گرا اشک تو کیا رہ گئی اوقات
ہے شام سے چرچا کہ وہ آئیں گے سحر کو — کیونکر مرے اللہ! کٹے گی یہ مری رات
گھر پر مرے آ کر کبھی مہماں نہ ہوئے تم — کرتا ہی رہا میں غمِ ہجراں کی مدارات
ازل سے ہی سرگشتۂ دید مست رہا میں — شاید مری تخلیق میں ہے خاکِ خرابات
معذور نہ ہونے دو تجھے میری وفا پر — گو میں بھی سمجھتا ہوں کہ ہے کیا مری اوقات

ہم نے بھی اٹھائی ہے بہت آج خرابی
واصف کو بلاؤ کہ چلیں سوئے خرابات

(۴۶)

مجھ کو یہ رنج کہ کب تک ہوں ان کی بیداد — ان کو شکوہ کہ ستم پر مرے کیوں ہے فریاد
آہ کچھ ایسا مرے دل کو اجاڑا تم نے — جیسے دلّی کو زمانے نے کیا تھا برباد
میری غیرت پہ کوئی حرف نہ آئے یارب! — ہے ادھر تاک میں بجلی تو ادھر ہے صیاد
خود بخود دل ہے کہ افسردہ ہوا جاتا ہے — کیا بتاؤں تمھیں کیا مجھ پہ پڑی ہے افتاد

اشک آنکھوں میں نہیں طاقت فریاد نہیں — کون اب ان کو سنائے گا ہماری روداد

دل مرا فتنۂ حاضر سے گھٹا جاتا ہے — آج انساں ہے ہر اک بند حیا سے آزاد

سوچتا ہوں کہ بایں لغزش پائے آدم — دوش پر کس کے ہے قائم فلک بے بنیاد

زندگی خود ہے یہاں ایک مسلسل عصیاں — کب تک امیدیں جنت کی جئیں گے زہاد

صورت موج صبا قطع سفر کر واصف
تیری منزل نہیں یہ کارگہ کون و فساد

(۴۷)

ترے غم میں عمر گزر گئی مری روح آئی نکھار پر — مجھے دیکھنا ہو تو جلد آ کہ چلا ہوں دوش بہار پر

مری کامیاب نگاہ بھی مرے شوق کو نہ پہنچ سکی — مری روح محو جمال تھی جو نظر گئی رخ یار پر

کبھی پست ہوں کبھی اوج پر کبھی ہست ہوں کبھی بے نشاں — یہ ہجوم عشوۂ کن فکاں مری ایک مشت غبار پر

مرے آنسوؤں کے خزینے ہیں اسی سرزمیں میں دبے ہوئے — مرا حق ہے عہد دراز سے تری خاک راہگذار پر

مری ناتوانی و خستگی مرے عزم کو نہ دبا سکی — تری راہ میں جو تھکا ہوں میں تو اڑا ہوں دوش غبار پر

مرے گھر جو آج تم آ گئے نہ الم رہا نہ گلہ رہا — وہ سناؤں آہ میں کیا تمہیں جو گزر چکی دل زار پر

شب ماہ و صبح باصفا مرا دل اداس ترے بغیر — مجھے کیا کہیں گے جو آ گیا کہیں حرف ضبط و قرار پر

مری زندگی تو فضول ہے کہ ہوئے نہ میرے وہ آج تک — کہیں موت بھی نہ ہو رائیگاں وہ اگر نہ آئے مزار پر

یہ نصیب واصف زار کا کہ اسی کا بندۂ عشق ہے
جو خدا سے بھی نہ ڈرے کبھی نہ ہو مہرباں دل زار پر

(۴۸)

ہنگام سحر آیا ہے دور شراب آخر — کب تک ہے تمہیں ہم سے یہ شرم و حجاب آخر

کھلنے ہی لگے ان پر اسرار شباب آخر — تم نے ہی لگا ہم سے اب ان کو حجاب آخر

تعمیل کتاب اول تاویل کتاب آخر — تدبیر و عمل اول تقریر و خطاب آخر

اس خاک کے پتلے کی کیا خوب کہانی ہے — مسجود ملک اول رسوا و خراب آخر

گو خود وہ نہیں کرتے بخشش میں حساب اول — دینا ہے مگر ہم کو اک روز حساب آخر

دیدار سے پہلے ہی کیا حال ہوا دل کا — کیا ہوگا جو اٹھیں گے وہ رخ سے نقاب آخر

مدت ہوئی بھیجا تھا اک خط بڑے ارماں سے — اب تک یہی سنتے ہیں آئے گا جواب آخر

ہم پہلے ہی کہتے تھے اے دل یہ محبت ہے — ہونا ہی پڑا تجھ کو رسوا و خراب آخر

محروم نہ رہ جانا کوتاہی ہمت سے
ہونے کو ہے اے واصف یہ بزم شراب آخر

(۴۹)

بدل ڈالو مری تقدیر کو مجھ سے خفا ہو کر — کہ تم جو بد دعا دیتے ہو لگتی ہے دعا ہو کر

ڈبو دیں گی یہ موجیں مجھ کو گرداب فنا ہو کر — خدارا میری کشتی کو سنبھالو ناخدا ہو کر

اسی کوچے سے وابستہ ہے موت و زندگی اپنی — کہاں جائیں گے مرنے کے لئے تم پر فدا ہو کر

کہیں شمع تمنا بجھ نہ جائے صرصر غم سے — کہ دل کی زندگی ممکن نہیں ہے بے مدعا ہو کر

خدایا تیرے گلشن پر یہ آفت کیسی آئی ہے — بتوں نے آہ کیا کیا گل کھلائے ہیں خدا ہو کر

حریفان مے الفت کہاں رخصت ہوئے ساقی — کہ بزم عیش اب تو رہ گئی ہے بے مزا ہو کر

وہ اک خاموش سجدہ آ سکھا دوں تجھ کو اے زاہد — قبول خاطر والا جو ہو جائے ادا ہو کر

یہاں تک اب تو لے آئی مجھے بیچارگی میری — کہ ایک اک لفظ آتا ہے زباں پر التجا ہو کر

جہاد حریت کا آہ! یہ انجام ہے واصف
کہ پہنچے ہم سر منزل مگر بے دست و پا ہو کر

(۵۰)

ہم سفر دور گئے بادیہ پیما ہو کر — رہ گئے راہ میں ہم نقش کف پا ہو کر

قیس اچھا رہا آوارۂ صحرا ہو کر — ہم کہیں کے نہ رہے شہر میں رسوا ہو کر

زندگانی کے ہر اک لمحے کو نعمت جانو — خواہ جینا پڑے ناکام تمنا ہو کر

صبحدم آکے وہ کہنے لگے کل آؤں گا — وعدہ پھر وعدۂ فردا رہا ایفا ہو کر

وقت ہے ایسے میں آکر مرے آنسو پونچھو — کیا کروگے جو رواں ہوں گے یہ دریا ہو کر

دل پہ جو حادثہ گذرا ہے اسے کیا کہیے — کیا قیامت ابھی اور آئے گی برپا ہو کر

رنگ اپنے مقدر کی سیاہی واصف
ان کے دل میں جو رہے ہم تو سویدا ہو کر

(۵۱)

اچھا نہیں ہے ہر ایک سے ہر دم یہ اختلاط — اس عمر میں تمھیں بھی تو لازم ہے احتیاط

وہ نغمہ و شراب نہ وہ عالم نشاط — اب کیا ہے لطف زیست کہ تہ ہو چکی بساط

رخ پر کبھی جو ان کے مچلتا ہے انبساط — دشوار کتنی ہوتی ہے اس وقت احتیاط

اتنا نظر سے اپنی گراؤ نہ مجھ کو تم — کیا کیا رہا ہے تم سے مرے دل کو ارتباط

پیتے ہیں ہم تو اشک بڑے اہتمام سے — دل کا معاملہ ہے کہاں تک ہو احتیاط

راہ فنا کے ہم تو مسافر ہیں دوستو! — قائم ہمارا ربط نہ دائم ہے یہ رباط

انسان ہے آج راہ ترقی پہ گامزن — انسانیت کا رخ ہے مگر سوئے انحطاط

قطرے کی ماہیت کو سمندر سے پوچھیے — کوئی محیط ہے نہ یہاں ہے کوئی محاط

تیرا کرم کہ تو نے مجھے غم عطا کیا — میں خوب جانتا ہوں کہ تھی کیا مری بساط

کتنا ہی مجھ کو پست کیا روزگار نے — لیکن نہ آیا میرے عزائم میں انحطاط

واصف یہ آرزو ہے کروں عرض مدعا
بکھرے ہوئے لغات کو دیتا ہوں انضباط

(۵۲)

لگی تھی آگ سی دل سے جگر تک — نہ پوچھو ہم پہ کیا گزری سحر تک

سمایا ہے وہ میرے جان و دل میں
نہ پایا میں نے جس کا سنگ در تک

ادھر دیکھو تو شورش ختم ہو جائے
گلے شکوے ہیں سارے اک نظر تک

یقیں بڑھتا رہا لمحہ بہ لمحہ
ترے وعدے نے تڑپایا سحر تک

وفا کی منزلیں کتنی کٹھن تھیں
بچھڑ کر رہ گئے سب ہم سفر تک

کیا تھا شوق آزادی نے بیخود
نہ تھی انجام کی ہم کو خبر تک

کہیں کیا ماجرا سود و زیاں کا
لٹا سرمایۂ فکر و نظر تک

غنیمت جانو ان لمحوں کو یارو!
ابھی پانی نہیں پہنچا ہے سر تک

کرشمہ ہے یہ عالی ہمتی کا
یہ مشت خاک جا پہنچا قمر تک

ستم کب تک تمہارے چپ سکیں گے
کہ فریادی ہیں یہ دیوار و در تک

وہ کیا آتے مرے مرقد پہ واصف
نہ پہنچی میرے مرنے کی خبر تک

(۱۳۵)

در و دیوار ہیں مقتل کے مصروف فغاں اب تک
تمہیں بھی یاد ہو شاید ہماری داستاں اب تک

نہیں معلوم کتنے ہو چکے ہیں امتحاں اب تک
مگر تیرے وفاداروں کی ہمت ہے جواں اب تک

یہ طوفان حوادث اور تلاطم باد و باراں کا
محبت کے سہارے کشتیٔ دل ہے رواں اب تک

کہاں چھوڑا ہے دل کو کاروان آہ و نالہ نے
کہ ہے آوارہ منزل یوسف بے کارواں اب تک

تلاش بحر میں قطرے نے کتنی ٹھوکریں کھائیں
سمجھ لینا جو خود کو بن ہی جاتا ہے گراں اب تک

مسافر تو گزر کر جا چکے شہر خموشاں سے
مگر ابھرے ہوئے ہیں ان کے قدموں کے نشاں اب تک

دل بیمار کو ہمدم! ہوائے سیر گل کیا ہو
کہ ہے نامعتدل آب و ہوائے گلستاں اب تک

نہیں معلوم کتنی دور محمل جا چکا ہوگا
مگر کانوں میں آتی ہے صدائے کارواں اب تک

ازل سے گوشۂ دل میں گونجتے ہیں زمزمے تیرے
مگر اے دوست میں نے تجھ کو پایا بے نشاں اب تک

عیاں افسردگیٔ گل سے ہے انجام گلشن کا ۔۔۔ مگر خون دل بلبل ہے صرف آشیاں ابتک

بہت کی قلزم تخئیل میں واصف نے غواصی
نہ نکلا درخور احباب کوئی ارمغاں ابتک

(۵۴)

اپنے کیے پہ کوئی پشیماں ہے آج کل ۔۔۔ ٹھیری ہوئی سی عمر گریزاں ہے آج کل
ذرہ حریف مہر درخشاں ہے آج کل ۔۔۔ قطرے کے دل میں شورش طوفاں ہے آج کل
صد جلوہ بے حجاب خراماں ہے آج کل ۔۔۔ سہما ہوا سا گنبد گرداں ہے آج کل
آنسو میں عکس نغمۂ دوراں ہے آج کل ۔۔۔ سمٹا ہوا سا عالم امکاں ہے آج کل
برہم مزاج فطرت انساں ہے آج کل ۔۔۔ کس مخمصے میں غیرت یزداں ہے آج کل
شیرازہ امید شکستہ ہے ان دنوں ۔۔۔ جمعیت خیال پریشاں ہے آج کل
قسمت کی نیرنگی کی کہانی نہ پوچھیے ۔۔۔ صبح وطن بھی شام غریباں ہے آج کل
نم کیا گئے بساط محبت الٹ گئی ۔۔۔ پھیکا سا رنگ صحن گلستاں ہے آج کل

ہے اک نگاہ مہر کی واصف کو آرزو
واصف کا دل شکستہ و ویراں ہے آج کل

(۵۵)

دل پہ جو کچھ بھی گزرتی ہے سہے جاتا ہے دل ۔۔۔ آہ کرنا چاہتا ہوں میں تو تھراتا ہے دل
کانپتا ہے مضطرب ہوتا ہے گھبراتا ہے دل ۔۔۔ پھر بھی کیا کیا تلخیاں الفت میں پی جاتا ہے دل
کیا خبر کیا حال ہو غم سے جو مل جائے نجات ۔۔۔ عافیت کے نام سے بھی اب تو گھبراتا ہے دل
بے طلب جتنا ملا بس میرے لائق تھا وہی ۔۔۔ ہاتھ پھیلانے سے اب انکار فرماتا ہے دل
دیکھتے ہی دیکھتے پہلو سے جاتا ہے نکل ۔۔۔ شوق میں اپنے مجھے برباد کر جاتا ہے دل
دیکھ کر دنیا کو اپنے غم سے ہم فارغ ہوئے ۔۔۔ اب تو غیروں کی مصیبت پر بھر آتا ہے دل

تیرے اعدا کیا کہیں گے دیکھ کر یارب مجھے
آج محرومی پہ اپنی آپ شرماتا ہے دل

دل سے وابستہ تھے میرے دل کے سارے حوصلے
دیکھ کر سامانِ جلوہ مجھ کو یاد آتا ہے دل

جانتا ہوں اس کی رحمت کا نہیں کوئی شمار
لیکن اس کی بے نیازی سے بجھا جاتا ہے دل

غم ستاتا ہے تو کر لیتا ہوں میں فکرِ سخن
کچھ نہیں واصف تو دم بھر کو بہل جاتا ہے دل

(۵۶)

بے وجہ نہیں رہتے ہیں ناشاد و حزیں ہم
افسوس کہ دل بھول کے آئے ہیں کہیں ہم

کیا پوچھتے ہو ہم سے کہاں کے ہیں مکیں ہم
سمجھو گے جہاں تم ہمیں رہتے ہیں وہیں ہم

پامال ہیں گو خاک سے کمتر بھی نہیں ہم
پہنچے ہیں کسی وقت سرِ عرشِ بریں ہم

دل ہے کہیں اور جان کہیں اور کہیں ہم
کیا ڈھونڈتے ہو ہم کو جہاں ہیں کہ نہیں ہم

چھوٹی نہ تری راہ گزر بعدِ فنا بھی
رکھنا قدم آہستہ کہ ہیں زیرِ زمیں ہم

اب کیا کہیں آخر تجھے اے مہرِ جہانتاب
تسلیم کیا ہم نے کہ ہیں ماہ جبیں ہم

ایمان نہ لائیں گے کبھی چھوڑ کے تجھ کو
بالغرض کہیں دیکھ بھی لیں تجھ سا حسیں ہم

باقی ہے بس اب دل میں یہی ایک تمنا
بھولیں نہ ترا نام دمِ بازپسیں ہم

ارباب وفا دہر سے رخصت ہوئے واصف
دیکھنے کو باقی رہے آخر میں ہمیں ہم

(۵۷)

بجھتے ہوئے چراغ فروزاں کریں گے ہم
تم آؤ گے تو جشنِ چراغاں کریں گے ہم

باقی ہے خاکِ کوئے محبت کی تشنگی
اپنے لہو کو اور بھی ارزاں کریں گے ہم

بیچارگی کے ہو گئے یہ چارہ گر شکار
اب خود ہی اپنے درد کا درماں کریں گے ہم

جوشِ جنوں سے جامۂ ہستی ہے تار تار
کیونکر علاجِ تنگیٔ داماں کریں گے ہم

اے چارہ ساز دل کی لگی کا ہے کیا علاج
کہنے سے تیرے سیر گلستاں کریں گے ہم

کیا غم جو حسرتوں کے دیے بجھ گئے تمام
داغوں سے آج گھر میں چراغاں کریں گے ہم

مطرب خدا کے واسطے لا اک نوائے تلخ
کب تک شکایتِ غمِ دوراں کریں گے ہم

آزاد ہو کے اور بھی دیوانگی بڑھی
اب آرزوئے گوشۂ زنداں کریں گے ہم

واصف کا انتظار ہے تھم جاؤ دوستو!
دم بھر میں طے حدودِ بیاباں کریں گے ہم

(۵۸)

آسمانوں سے ستارے توڑ کر لاتا ہوں میں
تیری بزمِ ناز میں کس شان سے آتا ہوں میں

ہر قدم پر تیرے ذروں کے نشاں پاتا ہوں میں
مدتوں سے تجھ کو یوں ہی ڈھونڈتا جاتا ہوں میں

جستجو میں تیری کچھ ایسا مزہ پاتا ہوں میں
راہ پا کر خود کسی جانب بھٹک جاتا ہوں میں

کیا بتاؤں کب سے جاری ہے یہ دستورِ خطا
تیرے اندازِ کرم پر ناز فرماتا ہوں میں

جھوم جاتا ہے ہر اک گلبن ریاضِ دہر کا
لڑکھڑا کر جام سے جب بادہ چھلکاتا ہوں میں

ہوں نشانِ راہ لیکن بے خبر منزل سے ہوں
راہبر ہوں پھر بھی تجھ کو بے نشاں پاتا ہوں میں

وہ عیادت کو مرے گھر پر سنا ہے آئیں گے
رخصت اے دشتِ جنوں گھر ڈھونڈتے جاتا ہوں میں

تھا ارادہ خوب لوٹوں گا مزے جلووں کے آج
لوٹنے آیا تھا لیکن خود لٹا جاتا ہوں میں

وہ نگاہِ ناز ہوتی ہے جو گرمِ التفات
جھوم کر واصف فضاؤں میں سما جاتا ہوں میں

(۵۹)

لغزشیں واصف کی جو مشہورِ دوراں ہو گئیں
خوش نصیبی سے وہی فرصت کا ساماں ہو گئیں

ایک دو گھڑیاں ملی تھیں کام کی اس عمر میں
ناگہاں دیکھا کہ غفلت میں گریزاں ہو گئیں

کیا کوئی سیارہ ٹکرایا ہے میری آہ سے
آسماں پر سیکڑوں شمعیں فروزاں ہو گئیں

لٹ گیا اے ہم نشیں! اخلاص و محنت کا صلہ — کیسی کیسی حسرتیں نذرِ حریفاں ہو گئیں
ہو گیا پامال اپنا جذبۂ فکر و عمل — دل کی ساری قوتیں مصروفِ طوفاں ہو گئیں
یاس و حرماں نے کیا پابندِ تسلیم و رضا — میری کافر حسرتیں آخر مسلماں ہو گئیں
ہو چلا تھا انس مجھ کو اضطرابِ بحر سے — موج کی اٹھکھیلیاں بھی نذرِ طوفاں ہو گئیں
دیکھنا مضرابِ غم سے کس نے اب چھیڑا ہے ساز — کشتگانِ عشق کی روحیں غزل خواں ہو گئیں
ان سے جب نظریں ملیں پھر کس کو اپنا ہوش تھا — بس یہ دیکھا تھا کہ پلکیں ان کی لرزاں ہو گئیں
جلوہ افگن تھیں یہاں کیا کیا مبارک ہستیاں — دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے پنہاں ہو گئیں

اب کہاں واصفؔ ملیں گی وہ گزشتہ صحبتیں
اب وہ باتیں سر بسر خوابِ پریشاں ہو گئیں

(۶۰)

وفا کا رشتہ سب احباب دانستہ توڑ دیتے ہیں — بگڑتی ہے تو سارے عہد و پیماں توڑ دیتے ہیں
ذرا سوچا تو ہوتا اے مرا دل توڑنے والے — کہیں مہمان بن کر گھر کا ساماں توڑ دیتے ہیں
تجھے لازم ہے گلچیں پاسِ آدابِ تماشا بھی — وہ ناداں ہیں جو دستورِ گلستاں توڑ دیتے ہیں
دلیلِ کامرانی ٹوٹ جانا ہے سہاروں کا — کہ خود اپنا سفینہ اہلِ ایماں توڑ دیتے ہیں
نہ ہنس ان پا شکستہ خستگانِ راہِ الفت پر — انھیں قدموں سے یہ حدِ بیاباں توڑ دیتے ہیں
پلا دیتے ہو تم جن میکشوں کو اپنی آنکھوں سے — وہ اپنے عزم سے دیوارِ زنداں توڑ دیتے ہیں

ڈرو! اے دوستو! واصفؔ کے نالوں کی رسائی سے
کہ یہ نالے حدودِ چرخِ گرداں توڑ دیتے ہیں

(۶۱)

بیگانۂ خلش کا یہاں کچھ بھرم نہیں — مطرودِ بارگاہ ہے جس دل میں غم نہیں
پاسِ وفا خیالِ کرم قصدِ التفات — سب کچھ ہے تیرے دل میں مگر ایک ہم نہیں

تیری نگاہِ خاص نے اتنا کیا بلند — دل مبتلائے وہمِ حدوث و قدم نہیں

کچھ بوالہوس کا خوف تو کچھ شرمِ اہلِ دل — کیا لطف حسن و عشق جو محفل میں ہم نہیں

واصفؔ کی زندگی تو ہے ویراں ترے بغیر
اب تو وطن بھی گوشۂ غربت سے کم نہیں

(۶۲)

تجھے بھی روٹھ کے آخر رلاؤں گا اک دن — بس خلوتوں میں تجھے یاد آؤں گا اک دن

بسیں میں نور نگاہوں میں کائنات لیے — مجھے تلاش کرو گے نہ پاؤں گا اک دن

نئی فضا میں بڑھایا ہے ولولوں نے قدم — نصیبِ خفتہ کو اپنے جگاؤں گا اک دن

نئی ادا سے ابھاروں گا جذبۂ دل کو — جہانِ عشق کو باغی بناؤں گا اک دن

فضائے خلد سے رحمت کی بارشیں ہوں گی — بہارِ رفتہ کو گلشن میں لاؤں گا اک دن

نہیں ہے وحشتِ دل کو یہ خاکداں کافی — میں اس کی عرش سے سرحد ملاؤں گا اک دن

ورائے وہم و گماں حدِ ہوش سے آگے — یقین و وجد کی بستی بساؤں گا اک دن

ریاضِ حسن کا ہر پھول سر جھکا دے گا — سرِ نیاز جو اپنا اٹھاؤں گا اک دن

نسیم لوٹے گی نرگس کی آنکھ جھپکے گی — نظر ملا کے جو میں مسکراؤں گا اک دن

گماں سے دور نظر سے نہاں یقیں سے بعید — تجھے بھی بزم میں اپنی بلاؤں گا اک دن

نظر کا دھوکا ہے واصفؔ نظامِ بود و نبود
نقابِ عارضِ فطرت اٹھاؤں گا اک دن

(۶۳)

دل کو جرمِ عشق سے پھر آشنا کرتا ہوں میں — اس کی رحمت آزماتا ہوں خطا کرتا ہوں میں

میرے حرماں سے نہ کھل جائے کہیں تیرا بھرم — ساقیا تیرے لئے کیا کیا دعا کرتا ہوں میں

حرفِ لب تک آتے آتے دیکھیے کیا حال ہو — آج پہلی بار عرضِ مدعا کرتا ہوں میں

میرے انجام محبت پہ لرز جاتے ہیں دل — جب کبھی شرح الم کی ابتدا کرتا ہوں میں
ساتھ کیا دے گی رہ الفت میں عقل نارسا — ہر قدم پہ اپنے دل کو رہنما کرتا ہوں میں

اس کو اپنے ظلم پر آصف حیا آتی نہیں
مجھ کو شرم آتی ہے جب ذکر جفا کرتا ہوں میں

(۶۴)

کوئی رفیق نہیں کوئی غمگسار نہیں — رہ فنا میں کوئی بھی کسی کا یار نہیں
مجھے نہ ترک محبت پہ کیجیے مجبور — کہ اپنے دل پہ مجھے کوئی اختیار نہیں
تمہارے وعدہ فردا کا اعتبار تو ہے — مگر حیات دو روزہ کا اعتبار نہیں
قفس میں رہنے کی عادت سی ہو گئی ہمدم — ہوا چمن کی مجھے اب تو سازگار نہیں
مجھے تو ہوش و خرد نے تھکا دیا ساقی — پلا پلا مجھے بارائے انتظار نہیں
تری نظر نے کچھ ایسا کرم کیا مجھ پر — خزاں کا خوف نہیں حسرت بہار نہیں

اجڑ گیا ہے جو آصف کا دل تو کیا غم ہے
کہ دل پہ سوز محبت کا انحصار نہیں

(۶۵)

اب عیش کی خواہش نہ مسرت کا ہے ارمان — دلی کی طرح دل بھی مرا ہو گیا ویران
کیا ہاتھ پسارے گا وہ بیگانوں کے آگے — اپنوں کا بھی جس نے نہ اٹھایا کبھی احسان
اب تم کو مبارک ہو فضا صحن چمن کی — بیمار محبت تو ہے کچھ دیر کا مہمان
بیٹھے ہو مری جان پہ جاتے ہو تو جاؤ — جانا ہی مقدر ہے تو اللہ نگہبان
خطرے ہی میں رہتے ہیں غریبان محبت — بچتی ہے اگر جان تو لٹ جاتا ہے ایمان
اب گرد بھی محمل کی دکھائی نہیں دیتی — باقی نہ رہا ان کی ملاقات کا امکان

کہہ دو کوئی جا کر کہ فدا ہو چکا واصف
اب تک ہیں وہاں میرے لئے قتل کے سامان

(۶۶)

مدت ہوئی کہ ہم پہ کرم کی نظر نہیں
کیونکر کہیں کہ ان کو ہماری خبر نہیں

کب تک تمھاری آنکھ میں آنسو نہ آئیں گے
جلتے ہوئے دلوں کا دھواں بے اثر نہیں

آجاؤ بے خطر کسی بیکس کی نعش پر
کس کا قتیل ہے یہ کسی کو خبر نہیں

مضراب غم سے تار نفس نغمہ ریز ہے
جب تک یہ زندگی ہے الم سے مفر نہیں

اے میری حسرتو! ابھی سو جاؤ رات ہے
یہ آہ کی چمک ہے نمود سحر نہیں

کردار اگر نہیں ہے تو گفتار بے اثر
بسیار گو کی بات کبھی معتبر نہیں

واصف کو تم نہ چشم حقارت سے دیکھنا
بیشک ہے کم نصیب مگر بے ہنر نہیں

(۶۷)

گردش چشم ناز کیا جانیں
میکشی پا کباز کیا جانیں

مے کی وجہ جواز کیا جانیں
یہ ہنر پاکباز کیا جانیں

راز غم سے جو آشنا نہ ہوئے
لذت ضبط راز کیا جانیں

آنسوؤں سے نہ ہو وضو جن کا
وہ طریق نماز کیا جانیں

میری لغزش کو دیکھنے والے
لغزش پائے ناز کیا جانیں

جان دیتے ہیں پل میں پروانے
رات بھر کا گداز کیا جانیں

ٹھوکریں بھی جنھیں نصیب نہ ہوں
راہ وحشت کے راز کیا جانیں

ہر تکلف سے بے نیاز ہے عشق
ہم حدود نیاز کیا جانیں

آشیانوں کی فکر ہے جن کو
فطرت شاہباز کیا جانیں

موت سے کشمکش نہ ہو جن کی — زندگی کا وہ راز کیا جانیں
چارۂ غم تو آج تک نہ ہوا — ہم تمھیں چارہ ساز کیا جانیں
قصۂ نجد و ماجرائے یمن — ساکنانِ حجاز کیا جانیں

درد ہی دل کی ہے دوا واصف
بے دوا چارہ ساز کیا جانیں

(۶۸)

وارفتگی پہ میری یہ قہر و عتاب کیوں — دیوانہ کہہ کے تم نے کیا تھا خطاب کیوں
یہ اہتمام شیشۂ و جام شراب کیوں — اک چشم التفات سے ہے اجتناب کیوں
دل کے معاملات ہوں نذرِ کتاب کیوں — آئے ہمارے نام کسی کا جواب کیوں
جو رزق بے حساب خدا نے عطا کیا — بندوں سے لیں گے حشر میں اس کا حساب کیوں
تھا ایک ہی حجاب اجل نے اٹھا دیا — لاشے سے میرے تم کو ہے اتنا حجاب کیوں
کیا مسجدوں میں وعظ کی ہمت نہیں رہی — رندوں میں آکے شیخ! ہوئے تم خراب کیوں
جز مفلسی نہیں مجھے کوئی گناہ یاد — لیتے ہیں یہ گناہوں کا میرے حساب کیوں
رندانِ میکدہ میں کوئی بوالہوس نہیں — اہلِ کرم سے تم کو ہے یہ اجتناب کیوں

واصف جو آنکھ وقتِ سحر باوضو نہ ہو
دیکھے جمالِ دوست کو وہ بے نقاب کیوں

(۶۹)

گمنام و کم آمیز ہوں معدوم نہیں ہوں — حیرت ہے کہ اپنوں کو بھی معلوم نہیں ہوں
ہے ذرۂ ناچیز بھی اک پارۂ خورشید — دیکھو تو سہی! نقطۂ موہوم نہیں ہوں
ناکارہ و ناقص ہوں خطاکار ہوں لیکن — ساقی کی عنایات سے محروم نہیں ہوں
معصوموں کے اطوار بہت دیکھے ہیں میں نے — اللہ کا احسان ہے معصوم نہیں ہوں

نالش مری ممنون گلو بند نہیں ہے
جوہر ہوں مگر جوہر منظوم نہیں ہوں

آزاد ہے فطرت مری دل میرا غنی ہے
گردوں کی ستم گاری سے مغموم نہیں ہوں

تلبیس و تملق مری غیرت کے منافی
جاں دادۂ اندیشۂ مقسوم نہیں ہوں

نازاں ہوں کہ خادم ہوں در پیر مغاں کا
بچتا ہوں تکلف سے کہ مخدوم نہیں ہوں

مانا کہ میں اک حرف غلط ہوں مگر اے دوست
کیا صفحۂ دل پر ترے مرقوم نہیں ہوں

ہے کچھ تو مرا حق ترے کوچے کی زمیں پر
گو تیرے لئے لازم و ملزوم نہیں ہوں

ہے سوز بھی دل میں مرے اور ساز بھی لیکن
آتش کدۂ سازش مذموم نہیں ہوں

کیونکر مرا گھر تم کو ملے کون بتائے
القاب و خطابات سے موسوم نہیں ہوں

تدبیر کبھی مجھ کو سمجھنے کی بھی کرتے
میں آیۂ تقدیر کا مفہوم نہیں ہوں

میں کیا کروں حاسد کو جو آزار لگا ہے
سرِ دفترِ گنجینۂ مقسوم نہیں ہوں

سنتا ہوں یہ الزام کہ ظالم ہے یہ واصف
صد شکر کہ بیچارۂ مظلوم نہیں ہوں

(۷۰)

مفلس میں قناعت نہ سخاوت ہے غنی میں
کم ان میں سے کوئی بھی نہیں راہزنی میں

کیوں قتل مجھے کرکے بناتے ہو تماشا
سوچو تو ہے کچھ اور مزہ دل شکنی میں

بڑھتا ہوا طوفان ہے یا اس کی جوانی
کس طرح سمائے گی یہ تنگ پیرہنی میں

اک قطرۂ خون شہدا ہم اسے کہتے
ہوتی جو حرارت بھی عقیق یمنی میں

مکار ہو مغرور ہو پر فن بھی ہو تم دوست
لیکن ابھی بیٹھے ہو دریدہ دہنی میں

ہاتھ آئے وہ کیونکر کہ قرار اس کو نہیں ہے
بجلی ہے تڑپتی ہوئی نازک بدنی میں

خدمت کی تمنا نہ وصیت کی ضرورت
کیا خوب ہے مرنا بھی غریب الوطنی میں

پنہاں ہیں خموشی میں یہاں لاکھ افسانے
ہے فرق مری اور تری کم سخنی میں

واصف کے جگر میں نہ تھی اک بوند لہو کی
سرخی کی جھلک بھی نہیں نیزے کی انی میں

(۷۱)

صہبا نہیں مینا نہیں پیمانے نہیں ہیں
ہم ہوش میں بھی ہیں کہ خدا جانے نہیں ہیں

یہ ذرے تو میرے لئے بیگانے نہیں ہیں
کیا یہ وہی صحرا وہی ویرانے نہیں ہیں

آ ہم سفر اس خاک پہ دو اشک بہا لیں
مدفون یہاں کیا مرے افسانے نہیں ہیں

کیوں مجھ کو بلایا گیا صحرائے عدم سے
کافی مری وحشت کو یہ ویرانے نہیں ہیں

یہ دفتر بے معنئ ارباب وفا ہے
عنوان ہی عنوان ہیں افسانے نہیں ہیں

دامن کو نہ جھٹکو مری تربت کو مٹا کر
یہ ذرے تمہارے لئے بیگانے نہیں ہیں

مل جائیں تو ممکن نہیں پھر ان کی جدائی
دو دل ہیں یہ تسبیح کے دو دانے نہیں ہیں

یہ صبح درخشاں ہے کہ انجام محبت
اب یاد صبا کو بھی وہ افسانے نہیں ہیں

معلوم ہیں واعظ کے کمالات و فضائل
ہم خوگر تسلیم ہیں دیوانے نہیں ہیں

جان و دل و ایمان سے بڑھ کر ہے یہاں کیا
گو لائق درگاہ یہ نذرانے نہیں ہیں

وہ ناز و ادا وہ گلے شکوے وہ تبسم
گلشن میں کسے یاد وہ افسانے نہیں ہیں

معذور سمجھ گر کوئی تقصیر ہوئی ہے
ہم ہوش میں اس وقت خدا جانے نہیں ہیں

سیراب انھیں آبلۂ پا سے کیا ہے
یہ کانٹے بھی واصف کوئی بیگانے نہیں ہیں

(۷۲)

کافی ہیں وہ حالات جو آنکھوں سے عیاں ہیں
ہم دل کی کہیں ایسے وہ دل والے کہاں ہیں

کھلتے نہیں جو راز مرے دل میں نہاں ہیں
کیا کیا مری وحشت پہ عزیزوں کو گماں ہیں

مدت ہوئی گزرے ہوئے محمل کو ادھر سے
کچھ دھڑکنیں اب تک مرے سینے میں نہاں ہیں

واعظ کو مبارک رہے یہ صدر نشینی
ہم لوگ تو خدام در پیر مغاں ہیں

کہتے نہیں کچھ بھی نہ یہاں کی نہ وہاں کی
پھر کیوں یہ ستارے مری جانب نگراں ہیں

آ جاؤ سنو تو سہی بیمارِ الم کی
مبہم سے کچھ الفاظ ہیں جو وردِ زباں ہیں

آزادی کی منزل پہ سفر ختم نہیں ہے
آگے ابھی کچھ اور بھی قدموں کے نشاں ہیں

گلشن کا احاطہ کہیں یہ آگ نہ کر لے
تنکے ابھی دو چار ہیں جو شعلہ فشاں ہیں

داؔصف کو ہی سجتا ہے یہ ویرانۂ وحشت
جامے سے جو باہر نہ ہوں وہ لوگ کہاں ہیں

(۷۳)

کوئی حکمت مرض عشق میں چلتی ہی نہیں
ایسی بگڑی ہے طبیعت کہ سنبھلتی ہی نہیں

یاد رکھنے کی جو باتیں تھیں بھلا دیں میں نے
اک تری یاد ہے جو دل سے نکلتی ہی نہیں

روشنیں روز بدلتا ہے زمانہ اے دوست
تیرے دیوانے کی رفتار بدلتی ہی نہیں

منتِ ابرِ بہاراں نہ خزاں کا شکوہ
دل کی بستی میں کوئی فصل بدلتی ہی نہیں

دشتِ وحشت ہو کہ ہو صحنِ چمن اے واؔصف
اب طبیعت کسی صورت سے بہلتی ہی نہیں

(۷۴)

نظر ہے مری منہم جانتا ہوں رقیبوں کی تشنیع و ذم جانتا ہوں
مگر اپنا جاہ و حشم جانتا ہوں تجھی سے ہے تیرا بھرم جانتا ہوں

سنیں گے مری آپ مجھ سے حکایت نہیں بے سبب ہے یہ مجھ پر عنایت
بھلا آئے لب پر مرے کچھ شکایت کرم آپ کا محترم جانتا ہوں

کہوں کیا کہ عزم سفر اب کہاں ہے ندامت سے اشکوں کا دریا رواں ہے
یہی پیشکش ہے یہی ارمغاں ہے میں آدابِ ملکِ عدم جانتا ہوں

نہ پوچھو مرا رنج حرماں کا سہنا مرے آنسوؤں کا شب و روز بہنا
تسلی کو کافی ہے ان کا یہ کہنا کہ میں تیرا رنج و الم جانتا ہوں
ترے غم سے دل سیر ہوگا نہ میرا نہ ہو کاش فرقت کی شب کا سویرا
ہمیشہ رہوں اور تصور ہو تیرا حیات دو روزہ کو کم جانتا ہوں
ابھی تیرے واصف کو باقی ہے حسرت ابھی دل میں ہے اس کے کچھ اور وسعت
ذرا چشم و ابرو کو دے اور زحمت کرم کو ترے اب بھی کم جانتا ہوں

(۷۵)

دم بھر اگر قرار نہ آئے تو کیا کروں ۔ دل سے کسی کی یاد نہ جائے تو کیا کروں
پنہاں ہو چشم شوق سے وہ آفتاب حسن ۔ ایسی بھی ایک شام جو آئے تو کیا کروں
جرم وفا میں جھیل رہا ہوں میں قید زیست ۔ ان کے بغیر موت نہ آئے تو کیا کروں
ہے ضعف سے یہ حال کہ اٹھتی نہیں نگاہ ۔ آنکھیں اگر زمانہ دکھائے تو کیا کروں
نومیدیٔ نظارہ سے جب بجھ گیا ہو دل ۔ ناگاہ وہ نقاب اٹھائے تو کیا کروں
حاصل ہے وہ سکون کہ اٹھوں نہ حشر تک ۔ لیکن سر مزار وہ آئے تو کیا کروں

واصف ہزار ضبط و تحمل کے باوجود
دل میں کسی کا غم نہ سمائے تو کیا کروں

(۷۶)

ہم سفر! تھم تو سہی دل کو سنبھالوں تو چلوں ۔ منزل دوست پہ دو اشک بہا لوں تو چلوں
محفل ناز میں کیونکر ہو رسائی ممکن ۔ ان سے ملنے کی کوئی راہ نکالوں تو چلوں
وائے حسرت کہ غم عشق بھی اب روٹھ چلا ۔ اپنے روٹھے ہوئے ساتھی کو منا لوں تو چلوں
ہر قدم پر ہیں مرے دل کو ہزاروں الجھاؤ ۔ دامن صبر کو کانٹوں سے چھڑا لوں تو چلوں
مجھ سا کون آئے گا تجدید مکارم کے لئے ۔ دشت امکاں کی ذرا خاک اڑا لوں تو چلوں

بس غنیمت ہے یہ شیرازۂ لمحاتِ بہار دھوم سے جشنِ خرابات منالوں تو چلوں
پاؤں زخمی ہوئے اور دور ہے منزل واصف
خونِ اسلاف کی عظمت کو جگالوں تو چلوں

(۷۷)

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن

دل کشی اب کوئی گلگشت خیاباں میں نہیں واقف اپنا کوئی اب صحنِ گلستاں میں نہیں
ضعف پیہم سے اگر مجھ کو نہیں تابِ سخن تم سمجھتے ہو تلاطم مرے ارماں میں نہیں
پیش کر نذرِ وفا اہلِ توکل کے حضور پرسشِ جنسِ وفا درگہِ سلطاں میں نہیں
دولتِ ہر دو جہاں جس سے گداؤں کو ملی آج وہ صبر و رضا مردِ مسلماں میں نہیں
خار ہوں تیری نظر میں ہوں گریزِ چمن کیا رگِ گل کا لہو خارِ گلستاں میں نہیں
کیا ہوا قیدِ قفس سے جو رہائی بھی ملی خاک بھی اب تو اڑانے کو گلستاں میں نہیں
یہ تو واصف بے جو رویا ہے پاندہ چمن
اشکِ شبنم کی نمی خاکِ شہیداں میں نہیں

(۷۸)

یہ مانا اہلِ ہوش اکثر مجھے غافل سمجھتے ہیں مگر یہ دل کی باتیں ہیں جو اہلِ دل سمجھتے ہیں
جدھر نظریں اٹھاتا ہوں یہی محسوس کرتا ہوں کہ گویا اہلِ محفل میرا رازِ دل سمجھتے ہیں
کوئی ان بیکسوں کے حسرت داماں کو کیا جانے جو ہر اٹھتے ہوئے طوفاں کو ساحل سمجھتے ہیں
یہ دنیائے ستم کیشی میں کیسا انقلاب آیا سنا ہے اب بھی وہ رحم کے قابل سمجھتے ہیں
پریشاں اس قدر جمعیتِ خاطر ہوئی اپنی کہ ہر آوارہ ذرے کو ہم اپنا دل سمجھتے ہیں
نفس کی آمد و شد ہی میں ہم کھوئے گئے ایسے کہ ہر تارِ نفس کو جادۂ منزل سمجھتے ہیں
یہ ان کے شہر میں کیا خوب ہے دستورِ خونریزی نہ وہ تلوار اٹھاتے ہیں نہ ہم قاتل سمجھتے ہیں

ہنر تیرا نہیں واصفؔ یہ ان کی دلنوازی ہے
اگر اہل ادب تجھ کو کسی قابل سمجھتے ہیں

(۷۹)

آیا ہوں دور سے میں تری جلوہ گاہ میں
کیا کیا گیا ہے یاد تجھے میں نے راہ میں
بجلی سی کوند جاتی ہے بخت سیاہ میں
سو سو ہیں نا بشیں تری اک اک نگاہ میں
راز فنا کو سمجھے تو اتنا سمجھ سکے
بس اک نئے مقام سے گزرے ہیں راہ میں
جلووں کے ازدحام میں نیچی نگاہ رکھ
اے دل وقار عشق ہے ضبط نگاہ میں
کہنے کو یوں تو پاک ہے الفت رقیب کی
آجاتی ہے ضمیر کی جھلکی نگاہ میں
کیا کوئی بد نصیب یہاں سے نکل گیا
ہے کچھ کمی سی آج تری بارگاہ میں
واصفؔ نہیں ہے لطف مسلسل تو غم نہ کر
کچھ اور بات ہے کرم گاہ گاہ میں

(۸۰)

مرنے میں تکلف ہم کو نہیں جینا بھی گوارا کرتے ہیں
تسلیم و رضا کے خوگر ہیں ہر طرح گزارا کرتے ہیں
جاں باز جو مقتل میں آکر یوں جان کو ہارا کرتے ہیں
جلاد مجھے تو یہ توبتا کیا وہ بھی نظارہ کرتے ہیں
یہ حسن پرستی کا چسکا ہے فیض تمہاری الفت کا
کھانے ہی کسی کا تیر نظر ہم تم کو پکارا کرتے ہیں
پنہاں ہے ہماری بات مگر محسوس کچھ ایسا ہوتا ہے
باہم یہ یگانے بیگانے سب ذکر ہمارا کرتے ہیں
منزل کا پتہ کب ملتا ہے صحرا میں بھٹکنے والوں کو

جب ان کا اشارہ ہوتا ہے تارے بھی اشارہ کرتے ہیں

اے کاش کوئی پوچھے تو سہی ان جاگنے والے تاروں سے

فرقت کی اندھیری راتیں ہم کس طرح گزارا کرتے ہیں

اک وہ بھی زمانہ آتا ہے محروم تمنا پر واصف

اغیار ترس کھاتے ہیں مگر احباب کنارا کرتے ہیں

(۸۱)

صحرائے جنون و وحشت میں ایسے کامل مل جاتے ہیں

جن کی اک جنبش مژگاں سے کھوئے ہوئے دل مل جاتے ہیں

اے دوست نہ کر ذلت کی نظر ان مسکینوں مجبوروں پر

ان خاک نشینوں میں اکثر جوہر قابل مل جاتے ہیں

تقدیر کچھ ایسی روٹھی ہے، دل صاف نہیں ہوتا ان کا

اظہار وفا کرتے کرتے، ہم خاک میں مل مل جاتے ہیں

نووارد راہ عشق و وفا! ہشیار کہ خطرہ دور نہیں

بھولی بھالی شکلوں میں چھپے، اکثر قاتل مل جاتے ہیں

پامال سہی برباد سہی، خاک پاک شہر خموشاں

اس خاک میں کچھ اہل نظر کو، دھڑکے ہوئے دل مل جاتے ہیں

انجام محبت کا ڈر ہے، کچھ رعب ہے ان کی عظمت کا

ہم دور ہی رہتے ہیں ان سے اور وہ ہیں کہ مل مل جاتے ہیں

کرنے کو نصیحت سب نے کی، ہونے کو فضیحت خوب ہوئی

پھر خوف نہیں رہتا ہے کسی کا جب دو دل مل جاتے ہیں

جس طرح وہ چاہیں قتل کریں، اول بھی فنا آخر بھی فنا

دم بھر کا تڑپنا ہے آخر، خاک میں بسمل مل جاتے ہیں

کہنے ہو سوالی کوئی نہیں، دیکھو تو سہی ڈھونڈو تو سہی
تسلیم و رضا کے ویرانے میں کچھ سائل مل جاتے ہیں

یہ دانش و حکمت کے مکتب، خالی ہیں حق آگاہوں سے
ہم جیسے خطاکاروں میں ہی، کچھ صاحب دل مل جاتے ہیں

کب محو زمانے سے ہوگا، افسانہ مری بربادی کا
اب تک ہر اک محفل میں، دو چار تو ناقل مل جاتے ہیں

سیلاب نے میرے اشکوں کے، روکا ہے یہاں آنے سے انھیں
خشکی پر دریا جب آئے، دونوں ساحل مل جاتے ہیں

حاصل ہو اگر ایمان و یقین انسان کا دل خوش رہتا ہے
طوفان کی زد میں اے واصفؔ سیکڑوں ساحل مل جاتے ہیں

(۸۲)

راز داری بھی رہے آزار میں — جگ ہنسائی ہے کھلی تکرار میں
رہ گئی وہ ڈوب کر گفتار میں — جو بلندی تھی کبھی کردار میں
بے مزہ ہے آج کل طبع سلیم — تلخئ حالات ہے افکار میں
آج تک جو راز پوشیدہ رہا — کھل نہ جائے نبض کی رفتار میں
میری محرومی کی رکھ لو آبرو — بات جا پہنچی ہے اب اغیار میں
کیسے کیسے قاہروں کے دبدبے — ہیں نہاں اجڑے ہوئے آثار میں
ہے وہ جوہر زینت طوق گلو — جو چمکتا تھا کبھی تلوار میں
مجھ کو غیروں کی طرح ساغر ملے — کیوں نہ ہوں پھر چشمکیں اغیار میں

سن کے واصفؔ کی غزل برہم ہیں وہ
بات کچھ ایسی نہ تھی اشعار میں

(۸۳)

برپا ہوں جب فتنے بجتی ہوں زنجیریں | بیدار نہیں ہوتیں سوئی ہوئی تقدیریں
بھولے ہوئے افسانے مٹتی ہوئی تحریریں | اک خواب جوانی کی ہیں سیکڑوں تعبیریں
قوموں کی تباہی کی یہ صاف نشانی ہے | رہ جاتی ہیں آخر میں تقریریں ہی تقریریں
معمورۂ الفت کو آباد سمجھتے تھے | دیکھا تو نظر آئیں گرتی ہوئی تعمیریں
دیکھو گے کہاں تک تم خاموش نگاہوں سے | یہ ڈوبی ہوئی نبضیں چلتی ہوئی شمشیریں
چھائی ہے زمانے پر تاریکی ہی تاریکی | پنہاں ہیں کہاں یارب ایمان کی تنویریں
ان سے کوئی ملنے کی صورت ہی نہیں بنتی | کرنے کو تو کر گزرے ہم سیکڑوں تدبیریں
جمہور کی شاہی میں الفاظ کی قیمت ہے | کس درجہ مقدس ہیں الفاظ کی تفسیریں
ارباب وفا کیونکر اس عہد میں جیتے ہیں | آنجھ کو دکھاؤں میں یہ یاس کی تصویریں
کس شوق سے محنت سے صحرا کو بسایا تھا | برباد نہ کر ظالم! اسلاف کی جاگیریں
میں ہوں کہ مری حالت تبدیل نہیں ہوتی | اور دہر میں برپا ہیں تغییروں پہ تغییریں
مظلوم کی فریادیں مانا کہ اکارت ہیں | دیکھی ہیں کہاں تم نے ایک آہ کی تاثیریں

ہر ایک ادا ان کی محبوب و پسندیدہ
واصفؔ کے مقدر میں تقصیریں ہی تقصیریں

(۸۴)

(تضمین بر اشعار ظل سبحانی بہادر شاہ ظفر رحمۃ اللہ علیہ)

کچھ نہ سوجھا نیک و بد غفلت میں مستی میں ہمیں | اب ملا لطف قناعت تنگدستی میں ہمیں
قدر رفعت کی ہوئی معلوم پستی میں ہمیں | کفر سے ایماں ملا اس ملک ہستی میں ہمیں

حق پرستی ہاتھ آئی بت پرستی میں ہمیں

اپنی نظروں میں تھی اپنی ہر خطا عین صواب ۔۔۔ ہر عمل کو اپنے سمجھا موجب اجر و ثواب
مخلصوں کی بات سے رہتا تھا ہم کو اجتناب ۔۔۔ کر دیا ہی نشۂ پندار نے ہم کو خراب
ہوش بارے آگیا جلدی سے مستی میں ہمیں

کیسی ذلت کیا بڑائی خوب پھینکا چرخ نے ۔۔۔ بے بسی بے زری دہائی خوب پھینکا چرخ نے
خوب ہی دنیا دکھائی خوب پھینکا چرخ نے ۔۔۔ اونچ نیچ اچھی جتائی خوب پھینکا چرخ نے
گہ بلندی پر ہمیں اور گاہ پستی میں ہمیں

اب مزاج عاشقی کے اور ہی کچھ رنگ ہیں ۔۔۔ آب و گل کے حوصلے کتنے بلند آہنگ ہیں
ان نگاہوں میں زمیں کی وسعتیں بھی تنگ ہیں ۔۔۔ جوش وحشت کے ہمارے اور ہی کچھ ڈھنگ ہیں
رہنے دے گا یہ نہ جنگل میں نہ بستی میں ہمیں

یاں نہ دولت کو بقا ہے اور نہ شوکت کو قیام ۔۔۔ آدمی ہونا ہے رسوا بھول کر اپنا مقام
کیا ہی عبرت خیز ہے واصف یہ شاہوں کا کلام ۔۔۔ اے ظفر جو کچھ کیے ہم نے زبردستی[۱] میں کام
ان کے بدلے مل رہے ہیں زیر دستی میں ہمیں

۱؎ اقتدار

(۸۵)

سمجھتے ہو جن کو اذیت کے آنسو ۔۔۔ حقیقت میں ہیں یہ محبت کے آنسو
نہ پوچھو کہ آنکھوں میں کیوں اشک آئے ۔۔۔ سمجھ لو انھیں تم مسرت کے آنسو
مبارک ہو غیروں کو ٹسوے بہانا ۔۔۔ نہیں ہوتے ظالم صداقت کے آنسو
تو رحم کی امید رکھو خدا سے ۔۔۔ اگر آنکھ میں ہیں ندامت کے آنسو
اٹھا کر انھیں اپنی آنکھوں پہ رکھو ۔۔۔ بڑے بے بہا ہیں حکومت کے آنسو
ترا بندہ اور روئے غیروں کے آگے ۔۔۔ گوارا ہیں کیونکر یہ ذلت کے آنسو
فقیروں کے حالات پر ہنسنے والو ۔۔۔ اکارت نہ جائیں گے غیرت کے آنسو

یہاں ہم نے دیکھی تھی واصف کی نزہت
بہا لیں ذرا آؤ عبرت کے آنسو

(۸۶)

پردہ ہٹا کے چہرۂ زیبا دکھاؤ تو
کہنے ہوئے وفا مجھے آنکھیں ملاؤ تو

کیا دیکھتے ہو مجھ کو سنا رو بتاؤ تو
یاران کاروان کی کہانی سناؤ تو

ویران ہے مدتوں سے گلستان آرزو
آ کر مرے قریب ذرا مسکراؤ تو

کچھ بھی نہیں ہوں میں کسی قابل نہیں ہوں میں
سینے میں میرے دل ہے ذرا آزماؤ تو

میرے بغیر تم بھی تو رہتے تھے بے قرار
تم کو بھی یاد ہے وہ زمانہ بتاؤ تو

اپنوں کی بے وفائی سے اکتا گئے ہیں ہم
اپنا بنا کے غیر کو بھی آزماؤ تو

ہاں میرے اضطراب سے رسوا ہوئے ہو تم
اس دل کا کیا علاج ہے آخر بتاؤ تو

واصف ہی آج زینت میدان عشق ہے
اس خستہ دل کو دے کے سہارا اٹھاؤ تو

(۸۷)

غیر کی بات کا لیتے ہو اثر جانے دو
چند لمحے تو مسرت سے گزر جانے دو

اپنی زلفوں پہ ان اشکوں کو بکھر جانے دو
شام عشرت کو ستاروں سے سنور جانے دو

اپنے اعجاز کو رکھو ہمیں مر جانے دو
کام دنیا میں کوئی ہم کو بھی کر جانے دو

میری گستاخ نگاہی کا گلہ ہی نہ رہے
وادیٔ دل میں تجلی کو اتر جانے دو

یاد رکھو کہ بدلتا نہیں آئین جہاں
یہ سفینہ ہے ستم کا اسے بھر جانے دو

آہ کی راہ میں یہ چرخ کہن حائل ہے
اب مری جان حزیں کو بھی ادھر جانے دو

ان کے گھر تک نہ ہوئی جس کی رسائی واصف
ایسے بیمار کو اللہ کے گھر جانے دو

(۸۸)

بیگانے سے بڑھ کر ہے جو ہے کوئی یگانہ
اک بادیۂ ریگ رواں ہے یہ زمانہ

کہنا بھی ہے کچھ ان سے ہمیں کچھ ہے چھپانا
کہتے نہیں بنتی غم الفت کا فسانہ

ہو جائے گا اعدا کے لئے ایک بہانہ
کھل جائے نہ تیرا کہیں اعراض مغانہ

انعام ہی سمجھوں گا اسے پیر مغاں گا
قسمت سے جو مل جائے مجھے دُرد شبانہ

شاید کہ کھلا راز تمھاری خفگی کا
فریاد! کہ ہے آج خفا ہم سے زمانہ

کچھ خون کے قطرے تھے جو باقی مرے دل میں
وہ قافلہ آنکھوں کو ہوا آج روانہ

محلول فضاؤں میں ہیں انفاس محبت
مرغان چمن گاتے ہیں واصف کا ترانہ

(۸۹)

کسے حال اپنا سناؤں خدایا ہو جائے زیر وزبر یہ زمانہ
کوئی سنگدل ایسا آئے کہاں سے جو سن لے مری بیکسی کا فسانہ

نہ صیاد کا ڈر نہ خوف خزاں ہے ملی مجھ کو وہ رفعت جاودانہ
بر غم فلک شاخ برق تپاں پر ازل سے ہے قائم مرا آشیانہ

ہر اک کے نہیں بس کا یہ روگ ظالم کٹھن ہے محبت کو دل میں چھپانا
کہیں تجھ کو رسوا نہ کر دے بالآخر یہ ہر بوالہوس سے ترا دستانہ

چلائے بہت تیر آہوں کے میں نے مگر جس کو دیکھا وہ ناکام آیا
بہ تیر نظر ہی کو رتبہ ملا ہے کہ خالی نہیں جانا اس کا نشانہ

تلفظ سے ہے پاک میرا تکلم کرے گا کوئی کیا مری ترجمانی
کبھی تم جو آنکھیں ملاؤ گے مجھ سے سنا دوں گا دم بھر میں سارا فسانہ

مدارات تحمل کرم اے مقدر بڑی آزمائش کا یہ وقت آیا

بھرم کھل نہ جائے کہیں میرے دل کا کہ ہوتا ہے اب ان کا محمل روانہ

شریک محبت نہ مجھ کو بناؤ تباہی پہ میری نہ آنسو بہاؤ
یہی مصلحت ہے مجھے بھول جاؤ پلٹ کر نہ آئے گا اب وہ زمانہ

یقین ہے کہ مقتل کے دیوار و در بھی شہادت مری بیگناہی کی دیں گے
چھپاؤں محبت کے انداز کیونکر قدم بہکے بہکے نظر مجرمانہ

ہوا شب کو آصف عجیب اک لطیفہ بپا ان کے گھر بزم شعر و سخن تھی
حریفوں نے تیکھی نگاہوں سے دیکھا پڑھی میں نے جب اک غزل عاشقانہ

(۹۰)

محشر میں ہم سے پہلے وہ داد خواہ نکلے
سمجھا تھا جن کو اپنا ان کے گواہ نکلے

روز جزا بھی ہم نے پائی نہ داد الفت
وہ پاک باز ٹھیرا ہم بے گناہ نکلے

کس کی پناہ ڈھونڈھیں اب کس کے پاس جائیں
کوچے سے تیرے ہم تو ہو کر تباہ نکلے

تھرا اٹھے زمیں بھی ہل جائے آسماں بھی
یوں روئیے تو شاید ملنے کی راہ نکلے

گو پھنک رہا ہوں غم میں لیکن ہے یہ تقاضا
ایک اشک بھی نہ ٹپکے موتھ سے نہ آہ نکلے

رہبر سمجھ کے ہم نے تھاما تھا جن کا دامن
وہ بھی ہماری صورت گم کردہ راہ نکلے

جنت سے ہم کو آصف تقصیر نے نکالا
دنیا سے بھی جو نکلے بے کر گناہ نکلے

(۹۱)

اگر دل یہ ہے تیری بادشاہی
نظر آتی ہے کیوں ہر سو تباہی

مدد اے جوشش اشک ندامت
بہت ہے فرد عصیاں پر سیاہی

بہت ہی سخت ہے قانون فطرت
ہراساں جس سے میری بے گناہی

کہاں یہ تنگیٔ صحرائے امکاں
کہاں ذوق جنوں کی بے پناہی

بہارِ زندگی تیری توجہ　　خزانِ دل ہے تیری کم نگاہی
ملی ہے مجھ کو الفت کی نشانی　　فغانِ شام و آہِ صبح گاہی
تجھے کیا ہو گیا ہے میرے واصف
کہ یوں پھرتا ہے تو واہی تواہی

(۹۲)

سفر آج سوئے خرابات ہے　　وہاں بھی ہماری ملاقات ہے
بڑا اہل فن ہے یہ پیرِ مغاں　　بڑی اس کے در پر رجوعات ہے
ہے اختر شماری و قطعِ نفس　　یہ دن ہے ہمارا تو وہ رات ہے
ہمارے چمن میں خزاں ہی نہیں　　یہاں تو ہمیشہ ہی برسات ہے
ملامت فضیحت مصیبت ستم　　یہ الفت کی ساری کرامات ہے
چلو دست واعظ پہ بیعت کریں　　اسی کام میں کچھ فتوحات ہے
یہ ندی کا ساحل یہ کالی گھٹا　　اگر تم بھی آؤ تو کیا بات ہے
ہوئی جاتی ہے دل کی دنیا تباہ　　ابھی ان سے پہلی ملاقات ہے
بجھی شمع یعنی سحر ہو گئی　　مری زندگی کیا ہے اک رات ہے
تری رحمتیں دور نزاز قیاس　　مری بندگی کیا ہے اک بات ہے
بہت دور جانا ہے واصف تمھیں
ابھی دردِ دل کی شروعات ہے

(۹۳)

یہ کس کا نغمۂ شیریں رسا گوش گراں تک ہے　　کہ مصروف تبسم میری جانِ ناتواں تک ہے
زمانہ خود فغانِ نیم شب کو ختم کر دے گا　　کہ تجھ سے ربط مجھ کو ارتباط جسم و جاں تک ہے
نشانِ راہ ناپیدا نہ ہمدم ہے نہ ہے رہبر　　مگر وحشت میں مجھ سے غبار کارواں تک ہے

کسے معلوم ہے انجام تیزیٔ سعیٔ پیہم کا
بتا اے رہرو مستی سفر تیرا کہاں تک ہے
کہاں تو اور کہاں ہم آہ دل میلا نہ کر ساقی
یہ صحبت چند لمحوں کی رحیلِ کارواں تک ہے
سنو یہ دل کی باتیں پھر سنانے کون آئے گا
کہ میری نغمہ پیرائی بہارِ گلستاں تک ہے
ہٹا کر پردہ عقلِ نارسا کا دیکھ تو واصف
کہ جذبِ دل کی وسعت پردہ گاہ لامکاں تک ہے

(۹۴)

ہنستا ہوں میں سب کی دیکھا دیکھی دل کی کسک کوئی کیا جانے
اس خندۂ بے کیف میں واصف اک غم کی جھلک کوئی کیا جانے
غنچوں کی ہنسی کوئی کیا دیکھے پھولوں کی مہک کوئی کیا جانے
ہوتی ہے اب تو سیرِ چمن سے سر میں دھمک کوئی کیا جانے
افسردہ ہوا ہے جوشِ جنوں اور شوق کے شعلے پست ہوئے
خاک برہم زدہ دل میں داغوں کی چمک کوئی کیا جانے
چہرے پہ وقارِ استغنا رفتار میں عزمِ مردانہ
ان اہلِ جنوں کے تلووں میں چھالوں کی تپک کوئی کیا جانے
یہ دل بھی طرفہ تماشا ہے اس رمز کو کوئی کیا سمجھے
مسرور تھا کب؟ مغموم ہے کیوں؟ کب تک جب تک کوئی کیا جانے
وہ قطرۂ ابرِ نیساں ہے یہ اخترِ شامِ ہجراں ہے
موتی تو چمک پر نازاں ہے آنسو کی دمک کوئی کیا جانے
جلووں کا تلاطم جوشِ قدح ساقی خنداں محفل شاداں
لیکن عاشق کی رگِ جاں میں مبہم سی کھٹک کوئی کیا جانے

محسوس تھکن جب ہوتی ہے اک جرعۂ غم پی لیتا ہوں
ہے دل کی دوا یہ تلخئ غم واصف یہ چسک کوئی کیا جانے

(۹۵)

فعلن فعولن فعلن فعلن چار بار

کیا ہی الم زا ہے کیفیت درد جدائی کے ماروں کی
حسرت لاحاصل میں گزری عمر ہی ساری بیچاروں کی
چارہ گری کیا ہو گی تجھ سے عشق و وفا کے بیماروں کی
سانس نہیں ہے یہ لرزش ہے ساز شکستہ کے تاروں کی
چین سے سونے والو تم بھی کاش کبھی تو دیکھو آ کر
چشم کشادہ مہجوروں کی آہ و فغاں شب بیداروں کی
آخر شب کے سناٹے میں ضبط کا دامن مجھ سے چھوٹا
زخمۂ غم سے ساری بندش ٹوٹ گئی دل کے تاروں کی
اہل وطن کے ہاتھوں میں سامان خیانت ہر دم حاضر
جوش جنوں کو میرے واصف کیا ہو تمنا دیواروں کی

(۹۶)

پے بہ پے جھونکے صبا کے دل کو تڑپانے لگے
آج پھر لمحات رفتہ مجھ کو یاد آنے لگے
آسماں پر اودی اودی جب گھٹا آنے لگے
ہائے وہ دل جس پہ آہوں کا دھواں چھانے لگے
دل کی بیتابی کا ہمدم گر سناؤں ماجرا
موج طوفاں کانپ اٹھے برق تھرانے لگے
آہ! تو نے کیا مری آنکھوں پہ جادو کر دیا
دیدہ بازی سے مری تارے بھی شرمانے لگے
وہ جنوں کی بے پناہی یہ بیاباں کے حدود
اس قفس میں کیوں نہ میری روح گھبرانے لگے
آنکھوں ہی آنکھوں میں کہنا عمر بھر کی داستاں
وائے محرومی وہ آئے بھی تو شرمانے لگے

کاش میری روح پہ یہ بار احساں بھی نہ ہو
آپ کیوں مرنے پہ میرے آج پچھتانے لگے

دل نے کروٹ لی کچھ ایسی آج کوئے یار میں
طائران خلد بھی طوبیٰ پہ تھرانے لگے

جس سے تم ملتے رہے کل تک یہ وآصف ہے وہی
کیوں نگاہیں پھیر لیں کیوں آج کترانے لگے

(٩٧)

آنسو بھی خشک ہو گئے دل کی متاع بھی جلی
چھوڑ کے مضطرب مجھے تو نے کبھی خبر نہ لی

حیف کہ دل کی آرزو دل ہی میں گھٹ کے رہ گئی
برسوں جو اس دیار میں پیار سے ناز سے پلی

جس کی نظر میں کچھ نہ ہو تیرے جمال کے سوا
اس کی نظر میں ایک ہے دشت ہو یا تری گلی

رشک نبات ہے تو ہو تیرا کلام ہم نشیں
غم سے ہوا ہوں تلخ کام زہر ہے قند کی ڈلی

حسرت و وحشت و جنوں لمحہ بہ لمحہ ہے فزوں
یاس میں آرزو میں ہے آج غضب کی کھلبلی

ختم ہوئی شب نشاط بجھ گئی شمع آرزو
ٹھیر تو جا دل حزیں! دیکھ تو صبح ہو چلی

راحت قلب و لطف زیست کچھ بھی نہیں جو تو نہیں
آ کے نگاہ ناز سے دل کی مرے کھلا کلی

آ کہ وفور گریہ سے دھوئی گئیں کدورتیں
آ کہ گداز شوق سے سینہ ہوا ہے منجلی

وآصف زار کو کبھی آیا نہ راس یہ چمن
چرخ ستم ظریف نے چھاتی پہ مونگ ہی دلی

(٩٨)

ہم نے کیا کیا کچھ کیا اس مضطرب دل کے لئے
کس قدر بے حاصلی چھپی ہے حاصل کے لئے

منزلیں طے کی ہیں کتنی ایک منزل کے لئے
مشکلیں کتنی اٹھائیں ایک مشکل کے لئے

دل میں ذوق سعی ہو آنکھوں میں نور رضا
ہے یہی آئین پابند سلاسل کے لئے

شمع کی لو اور یہ ہنگامۂ بود و نبود
ایک اشارہ مکتفی ہوتا ہے غافل کے لئے

آج پھر مقتل میں جوش اہتمام جلوہ ہے
آزمائش کیا ابھی باقی ہے بسمل کے لئے

اس طرف ہے دودِ آوارہ ادھر لاشوں کا ڈھیر — یہ معمّا حل طلب ہے اہلِ محفل کے لئے
کیا یہی ویرانہ منشا تھا مری تعمیر کا؟ — کیا یہیں آیا تھا میں تدبیرِ منزل کے لئے
آہ! کیا دن تھے کہ ساقی گلفشاں تھا بزم میں — بزم ہے گوہر بداماں آج سائل کے لئے

اس جہاں سے یوں گزر جا جیسے برقِ التفات
اور ہیں واصف ابھی کچھ مرحلے دل کے لئے

(۹۹)

آنکھیں برس کے کھل گئیں دل کی فضا نکھر گئی — آکے تری حریمِ ناز تیرے لئے سنور گئی
بیٹھا ہوں تیری راہ میں خستہ جگر شکستہ پا — گرمِ سفر ہے روزگار شام ہوئی سحر گئی
دل سے تھی تجھ کو تیری چاہ بس یہی ایک تھا گناہ — حیف کہ تیری اک نگاہ دل کا ہی کام کر گئی
اس کی مژہ پہ اشک تھا بزمِ پہ یا تھا آفتاب — اف وہ گھڑی بھی حشر کی دل پہ مرے گزر گئی
محفلِ شب میں کس کو تھا مجھ پہ گمانِ عاشقی — تیری نگاہ کی حیا تہمتِ عشق دھر گئی
اخترِ صبح! کیا کہوں اپنے وطن کا ماجرا — شمعِ خلوص بجھ گئی بزمِ وفا بکھر گئی
زیرکیٔ ملک سے ہے فطرتِ آدمی خجل — فتنۂ مشتِ خاک سے نبضِ فلک ٹھہر گئی
مژدۂ جوشِ گل کہاں کسی حدیثِ کوئے دوست — چھیڑ کے دل کے ساز کو موجِ صبا گزر گئی
اپنے دلِ عزیز کا سوگ منا رہا ہوں میں — شعلۂ شوق بجھ گیا جوششِ چشمِ تر گئی
سینہ ہوا ہے داغ داغ غم سے مجھے نہیں فراغ — ایک یہ فصلِ گل ہی کیا عمر یونہیں گزر گئی
تارِ نظر میں اشک سے موتی پرو رہا تھا میں — آہ! کہ فرطِ گریہ سے آبروئے گہر گئی

واصفِ بے نوا کا حال بلبلِ خوش نوا نہ پوچھ
نالے بھی رائگاں گئے آہ بھی بے اثر گئی

(۱۰۰)

تقدیر بھی یہ کارگہِ رنج و تعب تھی — اک لغزشِ معصوم قیامت تھی غضب تھی

جو زیست کبھی مرکزِ صد عیش و طرب تھی — آخر میں وہ اک لمحۂ عبرت کا سبب تھی
اب ہے طلبِ پاسِ وفا تم سے نہ جب تھی — فرصت مجھے خود اپنی وفاؤں سے کب تھی
وہ شانِ کرم رات کو ساقی نے دکھائی — ناصح کی نگاہوں میں بھی درپردہ طلب تھی
ہم آپ ہی آپ آتشِ غیرت میں جلے رات — پہنچے نہ سرِ شمع کہ وہ جائے ادب تھی
وہ ہجر کی رات اور وہ ساون کی گھٹائیں — تاریکیٔ قسمت سے فزوں ظلمتِ شب تھی
تھا غلغلہ افلاک میں نالوں سے کسی کے — دیکھا جو دمِ صبح تو اک جنبشِ لب تھی

طوفاں بقدم خاک بسر میکدہ بردوش
واصفؔ کی جوانی بھی قیامت تھی غضب تھی

(۱۰۱)

ہیں سیہ کار و سیہ رو تیرہ قسمت ہی سہی — یہ سیہ فانوس تجانے کی تہمت ہی سہی
پردہ دارِ دردِ دل ہے حرفِ منت ہی سہی — مایہ دارِ اشک ہے چشمِ مسرت ہی سہی
چھوٹ کر قیدِ حرم سے دیر کو جاتا ہوں میں — حلقۂ زلفِ برہمن کی اسارت ہی سہی
وائے محرومی کہ تم اب تک نہ اپنے ہو سکے — عمر بھر ہم نے حریفوں کی ملامت ہی سہی
بیت جاتا ہے زمانہ یاد رہ جاتی ہے بات — بے مروت ہم سہی تم بامروت ہی سہی
تو نے میرے دل کو بھی ہمدم ٹٹولا ہے کبھی — تیرے دل رکھنے کو میں مجبورِ عشرت ہی سہی
اب وطن بھی تیرے وحشی کے لئے ویرانہ ہے — خاک اڑانے کے لئے ایک دشتِ غربت ہی سہی
بس غنیمت ہے یہ ربطِ جسم و جاں اے ہمنشیں — فکرِ فردا گر نہیں امروزہ عشرت ہی سہی

کون ہے کوچے میں تیرے مردِ میدانِ وفا؟
واصفِ دل سوختہ سے تجھ کو نفرت ہی سہی

(۱۰۲)

آج ان کی بارگہ میں پرسشِ احوال ہے — کیا کہیں اپنی زبان سے ہم جو اپنا حال ہے

بے بضاعت مجھ سا اور دیدار تیرا ہو نصیب
اللہ اللہ کیا مقدر اور کیا اقبال ہے

کچھ وہاں کی بھی سناؤ اے شہیدانِ وفا
کیا گزرتی ہے دلوں پر کیا تمہارا حال ہے

آ کہ جی بھر کر اٹھائیں آج لطفِ زندگی
آہ! یہ کوتاہ دن مرہونِ ماہ و سال ہے

اے صبا: جا کر یہ کہنا غالبِ مرحوم سے
اب غمِ الفت کا پھر تیرے وطن میں کال ہے

بن ترے زندہ بھی ہیں تو زندگی کا لطف کیا
کم نصیبوں کے لئے خود زندگی جنجال ہے

ننگ فطرت ہے یہ انساں گر نہ ہو پہلو میں دل
آدمی کی آدمیت نیکیٔ اعمال ہے

کیوں گلہ کرتے ہو واصف غیر کی بیداد کا
غیر کی صورت میں اپنی شامت اعمال ہے

(۱۰۳)

یہ خوابیدہ تمنا کو جگانے کون آتا ہے
چمن میں پھر نیا فتنہ اٹھانے کون آتا ہے

مری بالیں پہ یہ آنسو بہانے کون آتا ہے
یہ اک قطرے کو دریا سے ملانے کون آتا ہے

مری تربت کی اب یہ خاک اڑانے کون آتا ہے
مری مٹی کو اپنے سر چڑھانے کون آتا ہے

مرے ایمان پہ بجلی گرانے کون آتا ہے
یہ تمیزِ حق و باطل مٹانے کون آتا ہے

بصد شانِ دل آرائی بصد اندازِ یغمائی
مرے قلب و جگر کو آزمانے کون آتا ہے

فضا مخمور بلبل مست گل بیخود ہوا رقصاں
چمن میں آج جشنِ مے منانے کون آتا ہے

گئے وہ جن سے تھی امید ہم کو پاسِ الفت کی
تمہاری بیکسی پر دل کڑھانے کون آتا ہے

بڑی بیداریوں کے بعد گہری نیند سوئے ہیں
شہیدانِ محبت کو جگانے کون آتا ہے

فرشتے دم بخود ہیں عرصۂ محشر میں ہے ہلچل
یہ اپنی داستانِ غم سنانے کون آتا ہے

بڑی مدت سے غیر آباد ہے یہ گوشۂ خلوت
کہ یوں چھپ چھپ کے اب آنسو بہانے کون آتا ہے

یہ پابندیٔ آدابِ جنوں واصف کے دم تک تھی
اب ان بادیہ رسموں کو چلانے کون آتا ہے

(۱۰۴)

حضورِ دوست میں اہلِ فغاں کی آزمائش ہے / زباں پر قفل ہے لیکن زباں کی آزمائش ہے

سبک ظرفی ہے اور رطلِ گراں کی آزمائش ہے / گراں جانی ہے اور تیغ و سناں کی آزمائش ہے

کہیں تابانیٔ حسنِ جواں کی آزمائش ہے / کہیں بے رونقیٔ شمعِ جاں کی آزمائش ہے

لہو رُلوا دیا سرگشتگی نے جس کی سننے والوں کو / سرِ بزم آج پھر اس داستاں کی آزمائش ہے

کہاں قسمت کہ اب وہ ہم زباں ہو ہم سخن مجھ سے / خود اپنے ہی دہن میں اب زباں کی آزمائش ہے

کھلے گا انجمن میں حسن کا بھی حوصلہ آخر / ابھی تو عشق کی تاب و تواں کی آزمائش ہے

ادھر یہ حکم ہے کھلنے نہ پائے رازِ پنہانی / ادھر نبضِ مریضِ ناتواں کی آزمائش ہے

ذرا خطرے سے اہلِ کارواں ہشیار ہو جانا / کہ اس صحرا میں نظمِ کارواں کی آزمائش ہے

فلک سے تابکے شکوہ فغاں کی نارسائی کا / سنبھل اے دل کہ اب سوزِ نہاں کی آزمائش ہے

جگر بھی دیکھ لینا پھر، اگر تم دیکھنا چاہو / ابھی تو شدت و تابِ کماں کی آزمائش ہے

زمین و آسماں اس امتحاں کی تاب کیا لاتے / یہ مشتِ استخواں اور دو جہاں کی آزمائش ہے

حقیقت کیا شکستہ سوختہ پامال تنکوں کی / مگر پھر بھی وقارِ آشیاں کی آزمائش ہے

یہ توہینِ حمیت یہ اذیت یہ ستم کیشی / دلِ مجبور کے عزمِ نہاں کی آزمائش ہے

بقدرِ ظرف لازم تھی شرابِ دید اے ساقی / سرِ مغرور و قلبِ شادماں کی آزمائش ہے

سنبھالو! قصرِ استبداد کو اے زر کے متوالو! / غمِ بے سود و سعیٔ رائگاں کی آزمائش ہے

جہاں والوں سے اب چلتا نہیں کارِ جہانبانی / خدایا تابکے اہلِ جہاں کی آزمائش ہے

کہاں تک یہ نظامِ کہنہ، کون و فساد آخر / کہاں تک مہر و ماہ و کہکشاں کی آزمائش ہے

گلستاں اور یہ زاغ و زغن کی کارفرمائی / غرض ناموسِ اہلِ گلستاں کی آزمائش ہے

ابھی کچھ دیر ہے واصف زمانہ پھر بھی بدلے گا
ابھی کچھ اور مردِ ناتواں کی آزمائش ہے

(۱۰۵)

غم سے جب دل تباہ ہوتا ہے — سارا عالم اک آہ ہوتا ہے
آہ! وہ وقت جب کوئی مجرم — حاضرِ بارگاہ ہوتا ہے
سوز و سازِ شرارِ عشق نہ پوچھ — کوہ بھی گھل کے کاہ ہوتا ہے
ہے یہ وہ منزلِ وفا کہ جہاں — آنکھ اٹھانا گناہ ہوتا ہے
کس نے دیکھا ہے بیر اوہ آنسو — جو عیاں صبح گاہ ہوتا ہے
کون یہ راز تم کو سمجھائے — کس طرح دل تباہ ہوتا ہے
لٹتے دیکھا ہے تم نے دلی کو؟ — دل بھی یوں ہی تباہ ہوتا ہے
اس نزاکت کو کوئی کیا جانے — ان سے کیونکر نباہ ہوتا ہے

کیا بہار اور کیا خزاں واصف
سب فریبِ نگاہ ہوتا ہے

(۱۰۶)

جب سے غم سازگار ہے پیارے — زندگی خوشگوار ہے پیارے
سبزۂ کوہسار ہے پیارے — آکہ دل بے قرار ہے پیارے
صحنِ گلشن میں بن ترے مجھ کو — پتی پتی شرار ہے پیارے
نام بھی میں نہ لوں محبت کا — دل پہ کیا اختیار ہے پیارے
باز آتا نہیں محبت سے — دل بڑا نابکار ہے پیارے
کھل نہ جائے دلوں کی بات کہیں — چشم کیوں شرمسار ہے پیارے
یوں نبھے گی یہ دوستی کب تک — دل میں کب تک غبار ہے پیارے
بات کرتے ہی غصہ آتا ہے — بات کیوں ناگوار ہے پیارے
کون تجھ کو عزیز تھا کل تک — آج کیوں مجھ سے عار ہے پیارے

یہ نازو نازو عشوہ حسن و ادا — تیرے دم کی بہار ہے پیارے
میرے ہی نغمۂ محبت سے — رخ پہ کیا کیا نکھار ہے پیارے
اپنے کوچے میں یوں نہ کر رسوا — میرا کچھ تو وقار ہے پیارے
یہ سر رہگذار خاک نشیں — مرد انجم شکار ہے پیارے
بڑھ کے گرتوں کو تھام لیتا تھا — یہ وہی شہسوار ہے پیارے
سامنے ہے خزاں تو کیا غم ہے — اس کے پیچھے بہار ہے پیارے
منتظر ایک آہِ سوزاں کی — رحمت کردگار ہے پیارے

یہ جو محفل میں سرنگوں ہے کوئی
واصفِ باوقار ہے پیارے

(۱۰۷)

ناصح ملے رقیب ملے چارہ گر ملے — انسان کیسے کیسے مجھے عمر بھر ملے
اس طرح کل وہ مجھ سے بوقت سفر ملے — بیگانہ جیسے کوئی سر رہگذر ملے
ہے آرزو کہ راہ میں وہ فتنہ گر ملے — ایسا کہاں نصیب ہے لیکن اگر ملے؟
لمحات انتظار کی لذت نہ پوچھیے — کیا بات اس فرح کی جو وقت سحر ملے
چھٹ کر قفس سے جب سوئے گلشن نگاہ کی — غنچے بھی ہم صفیر تھے بے بال و پر ملے
کیا ہو دلوں کا حال خدا جانے بزم میں — جس وقت بے ارادہ نظر سے نظر ملے
یہ جان و تن کا ربط جسے زندگی کہیں — ایسا ہے جیسے راہ میں دو ہم سفر ملے

واصف یہ سوچتا ہوں کروں التجائے وصل
مہلت مجھے ثبوت وفا سے اگر ملے

(۱۰۸)

مرے جنوں کو میسر نہیں کمال ابھی — کہ گھر اجڑنے کا ہونا ہے کچھ ملال ابھی

ابھی تو آئے ہو بیٹھو کہیں گے حال ابھی
مریض غم ہے تمھارا بہت نڈھال ابھی

فدا حضور پہ کس کس طرح ہوئے ہیں ہم
مگر ہماری وفا میں ہے قیل و قال ابھی

ابھی متاع دل و جاں بھی نذر کرنی ہے
نہیں ہے شیخ! یہ بنت عنب حلال ابھی

ہوا زمانہ کہ مل کر کوئی بچھڑ بھی گیا
مگر نظر میں ہے وہ جنت خیال ابھی

یہ ساری عمر کے ارمان رائگاں ہی سہی
دل غیور نہیں مائل سوال ابھی

کہاں وہ لمحہ جسے ڈھونڈتا ہے دل میرا
کہ ہوں رہین تماشائے ماہ و سال ابھی

سنائی اس کو زمانے کی داستاں میں نے
مگر سنا نہ سکا اپنے غم کا حال ابھی

صفائے گوہر خاطر کو دیکھتے کیا ہو
کہ خاک و خوں میں ہے غلطان و پائمال ابھی

قدم سنبھال کے رکھنا زمیں پہ اے دوست
نہیں ہوا مرے زخموں کا اندمال ابھی

گزر رہی ہے یہ غفلت میں زندگی آصف
نہ آیا دل میں کچھ اندیشۂ مآل ابھی

(۱۰۹)

ملامت گر بھی ہے غماز بھی ہے
مگر کوئی حریف راز بھی ہے؟

نگاہ ناز تیر انداز بھی ہے
یہ قاتل بھی ہے چارہ ساز بھی ہے

نہ پوچھو اس دل مضطر کی منزل
فلک پر بھی ہے پا انداز بھی ہے

نگاہ ناز سے کیونکر بچے دل
یہ بیگانہ بھی ہے ہمراز بھی ہے

نہیں معلوم کس کی ہے تمنا
یہ رسوائی مری اک راز بھی ہے

سن اے مست مے عیش و طرب سن
سکوت شب کی ایک آواز بھی ہے

شکستہ ہیں جو یہ شاہیں کے بازو
انھیں میں عظمت پرواز بھی ہے

جو دل پر تیر کھا کر مسکرائے
کوئی ایسا قتیل ناز بھی ہے؟

رخ واصف پہ یہ موج تبسم
گداز قلب کی غماز بھی ہے

(۱۱۰)

مرا پروانۂ دل اپنی منزل یاد رکھتا ہے
کہ جلتا ہے مگر آداب محفل یاد رکھتا ہے

ستارے یہ ستارے کیا کریں گے رہبری میری
مرا ہر اک قدم خود اپنی منزل یاد رکھتا ہے

نکالا تھا بڑی ذلت سے جس کو تو نے محفل سے
وہ جنت میں بھی جاکر تیری محفل یاد رکھتا ہے

بہت نازک سی حد ہے بیخودی میں اور مستی میں
وہی ہے باخبر جو حد فاصل یاد رکھتا ہے

مٹا کر اپنی ہستی رخ بدل دیتا ہے طوفاں کا
بگڑنے پر بھی قوت اپنی ساحل یاد رکھتا ہے

خدا کا واسطہ دوں گا اسے میں نے یہ سوچا تھا
مگر اب تو خدا کو بھی وہ قاتل یاد رکھتا ہے

تلاش عزت و شہرت میں کیوں آوارہ ہے آصف
وہی انساں ہے جو خود اپنی منزل یاد رکھتا ہے

(۱۱۱)

خزاں ہو یا بہار آہ و فغاں یوں بھی ہے اور یوں بھی
مری آنکھوں سے جوئے خوں رواں یوں بھی ہے اور یوں بھی

کرم ہو یا ستم اب تو زباں یوں بھی ہے اور یوں بھی
مریض ہجر بے تاب و تواں یوں بھی ہے اور یوں بھی

بھڑک اٹھیں جگر کے داغ یا بجلی کہیں چمکے
نظر سے جادۂ منزل نہاں یوں بھی ہے اور یوں بھی

نہ ہنسنا راس آتا ہے نہ رونا کام دیتا ہے
مرے حق میں فلک نا مہرباں یوں بھی ہے اور یوں بھی

چھلکتا ہے کسی کا جام اور کوئی ترستا ہے

کہ دستورِ خرابات جہاں یوں بھی ہے اور یوں بھی

کلی کوئی کھلے یا پھول کوئی کھل کے مرجھائے

مگر قائم نظامِ گلستاں یوں بھی ہے اور یوں بھی

کبھی ہنس کر بھی روتے ہیں کبھی رو کر بھی ہنستے ہیں

سن اے غافل! کہ نیرنگِ جہاں یوں بھی ہے اور یوں بھی

بھلا مجھ ناتواں سے رشتہ ٹوٹے گا محبت کا

قسم لیتے ہو کیوں مجھ سے زیاں یوں بھی ہے اور یوں بھی

نہ دو بازو کو زحمت یہ نگاہِ ناز کیا کم ہے

ہلاکِ دیدِ جانِ ناتواں یوں بھی ہے اور یوں بھی

رہے دنیا سے بھی محروم اور عقبیٰ سے بھی غافل

یہ عمرِ چند روزہ رائگاں یوں بھی ہے اور یوں بھی

نہ دو اے کاش تکلیفِ سخن اے دوستو! مجھ کو

مرا جو حال ہے تم پر عیاں یوں بھی ہے اور یوں بھی

یہ دنیا سازگار آئے نہ آئے لیکن اے ہمدم!

بہر صورت ہمیں جینا یہاں یوں بھی ہے اور یوں بھی

ادھر ظلم و ستم ان کا ادھر طعنے عزیزوں کے

ہمارے سر پہ داصفؔ آسماں یوں بھی ہے اور یوں بھی

(۱۱۲)

یہ رازِ جنوں کون سمجھا رہا ہے	کہ دل خود بخود راہ پر آ رہا ہے
فضاؤں پہ کچھ ایسا چھا رہا ہے	چمن بے پئے رقص فرما رہا ہے
تغیر سا چہرے پہ کیوں آ رہا ہے	کوئی آج کیوں مجھ سے شرما رہا ہے

جھکی جا رہی ہیں ادھر ان کی نظریں — ادھر سارا عالم جھکا جا رہا ہے
انھیں اپنا وعدہ نہ یاد آ گیا ہو — سحر سے ہی دل میرا گھبرا رہا ہے
مرے دل میں آنے ہو گھر ہے تمھارا — مگر دل میں اے دوست اب کیا رہا ہے
یہ کیسی خلش دل میں ہوتی ہے پیہم — تحمل کا دامن چھٹا جا رہا ہے
ہوئی جا رہی ہے یہ کس سے محبت — یہ دل کس کے ہاتھوں لٹا جا رہا ہے
خطرہائے راہ محبت نہ پوچھو — کہ آنسو بھی پلکوں پہ تھرا رہا ہے
بہت حال اپنا چھپایا تھا میں نے — مگر اب تو ہر سو سنا جا رہا ہے
سنبھالو سفینے کو اے کھینے والو — کہ طوفان سر پہ چڑھا آ رہا ہے

ابھی تک ہوا و ہوس کا ہے بندہ
یہ واصف جو آزاد کہلا رہا ہے

(۱۱۳)

دل میں داغ عصیاں ہے رخ پہ نور یزداں ہے — کارساز عالم کا شاہکار انساں ہے
کس کا کیجئے شکوہ اس دیار غربت میں — بات بھی نہیں سنتا گر کوئی سخنداں ہے
ہیچ ہم سمجھتے تھے اب جو غور سے دیکھا — اک جہان بیتابی ذرۂ بیاباں ہے
آ تجھے سناؤں میں اک ترانہ آنکھوں سے — آج ہر بن مژگاں گوشۂ نیستاں ہے
مجھ سے پوچھ اے واعظ راز حقیقت کا — برق جادۂ منزل میرا داغ عصیاں ہے
اب بھی یاد ہے مجھ کو وہ نگاہ شرم آگیں — وہ جھکی ہوئی مژگاں نشتر رگ جاں ہے
ٹوٹتے ہیں تارے سے یاد جھلکتے ہیں آنسو — کائنات الفت میں حشر سا نمایاں ہے
کیسے ملے گا چھٹکارا اضطراب پیہم سے — جستجوئے راحت میں عمر بھی گریزاں ہے
اے خرام بے پروا اف یہ سبزۂ نوخیز — فرش پا ہی لیکن زادۂ گلستاں ہے
خواب میں جو وہ آئے زلف ان کی برہم تھی — جب سے ہم نشیں میرا دل بہت پریشاں ہے

سوچتا ہوں جی اٹھوں پھر کسی کا لے کر نام
قتل پر مرے واصف اب کوئی پشیماں ہے

(۱۱۴)

مدارات لازم اک مہماں کی — الہیٰ! رہے خیر پیر مغاں کی
نہ باقی رہی جس میں طاقت بیاں کی — تمنا ہی کیا اس دل نیم جاں کی
جو باقی ہو حسرت مرے امتحاں کی — تو گردش کو روکو ذرا آسماں کی
نہ ہو غم تو دل کی حقیقت ہی کیا ہے — مکیں سے ہی بنتی ہے عزت مکاں کی
صدائیں سی کانوں میں کچھ گونجتی ہیں — خبر لاؤ کوئی مرے کارواں کی
ابھی طاقت ضبط ہے میرے دل میں — ضرورت نہیں ہے مجھے رازداں کی
ادھر نیچی نظریں ادھر ضبط پیہم — خبر کس کو ہو میرے سوز نہاں کی
نہ توڑو محبت ذرا اور ٹھہرو! — ادھر ہی لگی ہے نظر آسماں کی
جدائی تو ہم تم میں ہو کر رہے گی — کہ رسم کہن ہے یہ دو دجہاں کی
کہیں برق تم پر نہ ہو جائے مائل — گلو! خیر مانگو مرے آشیاں کی

سنایا ہے واصف کو قسمت نے ساقی
نہ کر آج تو فکر سود و زیاں کی

(۱۱۵)

کبھی جھلکا طرف حجاب سے کبھی جھانکا گوشۂ بام سے
مری کم نگاہی کو ہے گلہ ترے حسن برق خرام سے
جو یقین نہیں ہے تو فائدہ نہ سجود سے نہ قیام سے
کہ ہزار منزلیں طے ہوئیں مری ایک لغزش گام سے
دل ناتواں کی بساط کیا کبھی مر مٹا کبھی جی اٹھا

تری ٹھوکروں کے طفیل سے نئے عشوہ ہائے خرام سے

تجھے کیا بتاؤں میں ہم نشیں نہیں کھیل غم کا نباہنا
یہ ہے اور بات کہ چپ رہوں کبھی احتیاط مقام سے

کوئی سن سکے تو سناؤں میں جو کھلی ہیں مجھ پہ حقیقتیں
کسی میگسار کی صبح سے کسی غم نصیب کی شام سے

رہے جھونکے باد نسیم کے رہے چھینٹے ابر بہار کے
مگر آج تک نہ ملا سکوں مرے دل کو سوز دوام سے

ابھی کاٹنی ہے شب فراق ابھی جھیلنی ہیں مصیبتیں
دل زار تجھ کو یہ کیا ہوا کہ ہے مضمحل سر شام سے

یہ بنا رہے ترا میکدہ وہ شراب دے مجھے ساقیا!
کہ بدل دوں گردش چرخ کو فقط ایک گردش جام سے

اسی اجنبی سے ہے دوستی اسی بے وفا سے ہے واسطہ
نہ نوازے آصف زار کو جو کبھی جواب سلام سے

(۱۱۶)

نہ گزرے ادھر ناگہاں چلتے چلتے — اجاڑا مرا آشیاں چلتے چلتے

مری یاد ان کو بس اتنی ہے جیسے — سنی ہو کوئی داستاں چلتے چلتے

یہ وحشت کی دشوار راہیں خدایا — بھٹک جائیں نہ کارواں چلتے چلتے

خدایا زمانے کی منزل کہاں ہے — بہت تھک گیا آسماں چلتے چلتے

ذرا ڈھونڈھنا میرے آنسو کو یارو — مسافر ہوا گم کہاں چلتے چلتے

سنبھالا تو دل کو بہت وقت رخصت — کھلا میرا راز نہاں چلتے چلتے

نہ سمجھی کسی نے زباں میری واصف
یوں ہی رہ گئی کل زباں چلتے چلتے

(۱۱۷)

زمانے میں اسی انسان کی توقیر ہوتی ہے
نظر جس کی گداز عشق کی تفسیر ہوتی ہے
ملے گا کس طرح موقع مجھے عرض تمنا کا
تصور میں بھی خشم آگیں تری تصویر ہوتی ہے
نہ ہو مایوس ناکامی پہ اپنی اے دل ناداں
شکست آرزو سے زندگی تعمیر ہوتی ہے
خود اپنی آگ میں جل مرتے پروانے تو اچھا تھا
کہ ان گستاخیوں سے شمع بھی دلگیر ہوتی ہے
ہو محفل میں کوئی تو گرفتار بلا واصف
ترے نغموں میں تمکیں آزما تاثیر ہوتی ہے۔

(۱۱۸)

گلستاں جب آیا نظر اڑتے اڑتے
تھکے یک بیک بال و پر اڑتے اڑتے
پہنچ ہی گئی دشمنوں تک بھی آخر
مری بیخودی کی خبر اڑتے اڑتے
فقط اک دھواں سا ہے سینے میں باقی
ہوئی دل کی تمت شرر اڑتے اڑتے
خدا خیر رکھے کہیں راہ بھولا
مرا طائر نامہ بر اڑتے اڑتے
کرشمے سکھائے گی آخر جوانی
اڑے گا وہ ظالم مگر اڑتے اڑتے
بہت زور تھا اپنے بازو میں لیکن
ہوئے صید ہم بے خبر اڑتے اڑتے
خدا دل کو سمجھے بڑا ہی نڈر ہے
لڑاتا ہے ظالم نظر اڑتے اڑتے
گئے جب سے تم دل اڑا جا رہا ہے
کہیں اڑ نہ جائے یہ گھر اڑتے اڑتے
اڑائیں گے کیا آپ واصف کے پرزے
اڑیں گے یہ پرزے مگر اڑتے اڑتے

(۱۱۹)

چن لیا قدرت نے تجھ کو آزمانے کے لئے
حوصلہ پیدا کر اے دل غم اٹھانے کے لئے

قتل کی دینے ہو دھمکی آزمانے کے لئے
کچھ سلیقہ چاہیے میرے ستانے کے لئے

گریۂ شبنم ہے غنچوں کے تبسم کی دلیل
اشک پیدا کر چمن میں مسکرانے کے لئے

ہم نشیں ہم بیکسوں کی بے نوائی کو نہ دیکھ
آسماں کافی ہے ہم کو سر چھپانے کے لئے

دم بخود نیچی نگاہیں پیکر تسلیم ہوں
مجھ سے بہتر کون ہوگا آزمانے کے لئے

ہے یقیں دل میں تو کچھ اندیشۂ طوفاں نہیں
موج اٹھ کر آئے گی تجھ کو بچانے کے لئے

کیا کرو گے سن کے افسانہ دل مظلوم کا
اک زمانہ چاہیے سننے سنانے کے لئے

کس قدر مشکل ہے دنیا میں مسرت کا حصول
کتنے ساماں ہوتے ہیں گل کو ہنسانے کے لئے

غم بڑی شے ہے اگر دل میں ہی پوشیدہ رہے
ہاں مگر دل چاہیے غم کو چھپانے کے لئے

مدعی ہرگز نہ ہوگا کوئی میرے خون کا
کون آئے گا تمہارے ناز اٹھانے کے لئے

بھول جائے ہم نشیں افسانۂ نجد و یمن
اب تو ہم ہیں باعث عبرت زمانے کے لئے

ہم جگانے آئے تھے اور خود ہی آکر سو گئے
اب ہمیں کون آئے گا واصف جگانے کے لئے

(۱۲۰)

دامن کو الجھنوں سے بچاتے گزر گئے
اچھے رہے جو ہنستے ہنساتے گزر گئے

آنسو رہ وفا میں گراتے گزر گئے
لوٹو! کہ ہم خزانے لٹاتے گزر گئے

ہستی کے رہگذار میں کس کو قیام ہے
آئے ادھر تو ملتے ملاتے گزر گئے

یہ بھی تری نگاہ کی توفیق تھی کہ ہم
اس رہگذر سے ٹھوکریں کھاتے گزر گئے

آیا ہماری راہ پہ ظالم نہ آج تک
آنکھیں رہ طلب میں بچھاتے گزر گئے

آئی بہار غنچۂ خاطر نہیں کھلا
یہ دن بھی یوں ہی اشک بہاتے گزر گئے

افسوس ان کے گھر کا پتہ ہی نہ مل سکا ہم جی سے اپنے آنے ہی جانے گزر گئے
قسمت کی برہمی کی حکایت نہ پوچھیے لمحات زیست ان کو مناتے گزر گئے
ملتی نہیں ہر ایک کو یہ دولت جنوں کتنے ہی آئے خاک اڑاتے گزر گئے
منزل ہماری دوزخ و جنت سے بھی بلند دیر و حرم سے آنکھ بچاتے گزر گئے

واصف سے ہم ملے جو سر رہگذار عشق
باہم دلوں کے داغ دکھاتے گزر گئے

(۱۲۱)

کس تمنا سے در اہل کرم تک پہنچے کاش مژدہ کوئی ارباب ہم تک پہنچے
کیا ہوا اہل ریاضت جو حرم تک پہنچے کتنے دل ہیں جو سرا پردۂ غم تک پہنچے
ہے غنیمت کہ زباں قصۂ غم تک پہنچے سخت مشکل ہے کہ بات ان کے ستم تک پہنچے
نہ ادھر جائیں کبھی ہم نہ وہ ہم تک پہنچے کیا بنے بات جہاں بات بھرم تک پہنچے
تیرے وعدے کا تو ہر طرح یقیں ہے مجھ کو بات وہ بات ہی کیا ہے جو قسم تک پہنچے
یہ حوادث کے تھپیڑوں کا کرم تھا ورنہ کس کی طاقت کہ ترے نقش قدم تک پہنچے
کہیو جا کر بصد آداب ہمارا بھی سلام اے صبا! تو جو شبستان عدم تک پہنچے
ان کی شیرینیٔ گفتار مسلم، لیکن کس قدر تلخ وہ طعنے تھے جو ہم تک پہنچے
آ کہ دامن کو ترے لعل و گہر سے بھر دوں کاش دامن ترا اس دیدۂ نم تک پہنچے
ایسی روداد لکھوں میں کہ رہے نام ترا ناتوانی میں اگر ہاتھ قلم تک پہنچے
تیرے بندوں نے صنم خانوں میں تجھ کو ڈھونڈھا اور صنم تیرے تجسس میں حرم تک پہنچے
حال پر میرے نہ پڑ جائے حریفوں کی نگاہ گفتگو بزم میں جب تیرے کرم تک پہنچے

فقر میں ہاتھ سے غیرت کو نہ دینا واصف
یہ فضائل ہیں جو اسلاف سے ہم تک پہنچے

(۱۲۲)

کہاں تک یہ تیری تغافل شعاری ہوئے ہم تو اب زندگی سے بھی عاری
یا بی رنج و حرماں یا بی عجز و خواری زمیں پر بھی ہے بار ہستی ہماری

وفادار یہ دوست کب رہ سکیں گے جو ہم سہہ چکے ہیں یہ کیا سہہ سکیں گے
نہ تم سن سکو گے نہ ہم کہہ سکیں گے کہ یہ زندگی ہم نے کیونکر گزاری

یہ خلق احبا یہ لطف عزیزاں بنی کے ہی ساتھی ہیں سب جن و انساں
نہ رکھو زمانے سے امید احساں بنائے گا کوئی نہ بگڑی تمھاری

کبھی شرم عصیاں سے ہوں پانی پانی کبھی یاد آتی ہے گزری جوانی
کہاں تک سناؤں میں دل کی کہانی لگائی جو بازی وہی اس نے ہاری

نہ ہے کوئی نیکی نہ ہے کوئی دولت مرے پاس کیا ہے بجز اشک حسرت
جو ہو جائے مائل ادھر تیری رحمت تو واصف کا پلڑا ابھی ہو جائے بھاری

(۱۲۳)

کیفیت گداز الم کچھ نہ پوچھیے
کیا حال تھا مرا شب غم کچھ نہ پوچھیے

راز و نیاز دیدۂ نم کچھ نہ پوچھیے
کیا کیا حکایتیں تھیں بہم کچھ نہ پوچھیے

بیچارگیِ اہل ہمم کچھ نہ پوچھیے
کس سمت اٹھ رہے ہیں قدم کچھ نہ پوچھیے

چہرہ اداس نیچی نظر دل میں اضطراب
رہتے ہیں کس خیال میں ہم کچھ نہ پوچھیے

ممکن ہے آپ کے دل نازک پہ ہو گراں
مائل ہیں کس حسین پہ ہم کچھ نہ پوچھیے

ہے سادگی ہماری متاع سکون دل
کیا کیا ہے ان سے چشم کرم کچھ نہ پوچھیے

جام شراب ساقی نہ رو کنار آب
کیا بات ہے خدا کی قسم کچھ نہ پوچھیے

ایک ایک راز کر دیا اشکوں نے آشکار
کیسا لٹا ہے دل کا بھرم کچھ نہ پوچھیے

کیسا گلہ کہاں کی شکایت کہاں کا رنج
ساقی کی اک نگاہ کرم کچھ نہ پوچھیے

ایک آہِ بدنصیب نے مجرم بنا دیا / کیا کیا ہوئے ہیں ہم پہ ستم کچھ نہ پوچھیے

واصف زہے نصیب کہ اس فتنہ گر نے آج
کھائی ہے میرے سر کی قسم کچھ نہ پوچھیے

(۱۲۴)

ہم اپنی خطاؤں کا اقرار نہیں کرتے / لیکن وہ کہیں جو کچھ انکار نہیں کرتے
ہم دل کو طلبگارِ آزار نہیں کرتے / پیار آتا ہے خود تم پر ہم پیار نہیں کرتے
دل دے کے ہوئے عاجز اب ہم کو نہ دو طعنے / اپنوں کو سرِ محفل یوں خوار نہیں کرتے
تھم جاؤ ذرا اے اشکو! ہے جائے ادب دیکھو / اس طرح تمنا کا اظہار نہیں کرتے
دل چور ہے زخموں سے بیمار محبت کا / مجبور پہ اے ظالم یوں وار نہیں کرتے
تم شاہ نگاراں ہو شاہوں کے چلن سیکھو / اجڑے ہوئے شہروں پر یلغار نہیں کرتے
ایسے بھی ہیں دل والے ان خاک نشینوں میں / کیسی ہی اذیت ہو اظہار نہیں کرتے
کافی ہے شرف اتنا ہم آپ کے بندے ہیں / رسوائی الفت سے ہم عار نہیں کرتے
کچھ تھوڑی سی زحمت ہے بس ان کو منا لاؤ / اے چارہ گرو! اتنا ایثار نہیں کرتے
جو بادِ سحر سے بھی آرام نہ پاتے تھے / اب ان کو بگولے بھی بیدار نہیں کرتے

اظہارِ صداقت پر مجبور نہ بن واصف
اتنا بھی زمانے کو بیزار نہیں کرتے

(۱۲۵)

سرگشتۂ سودائے انجام نہیں ہوتے / دل والے کبھی واصف ناکام نہیں ہوتے
کچھ اہلِ نظر ایسے ہیں آپ کی محفل میں / مرتے ہیں مگر پھر بھی بدنام نہیں ہوتے
ہے یاد مجھے اب تک وہ دشتِ جنوں جس میں / انکار نہیں ہوتے آلام نہیں ہوتے
ہیں خاص وہ کچھ لمحے فیضانِ محبت کے / تقسیم سرِ محفل انعام نہیں ہوتے

شہرت سے جو بچتے ہیں عزت انھیں ملتی ہے — گمنام جو رہتے ہیں گمنام نہیں ہوتے
کیا خوف حریفوں کا ہم دشت نوردوں کو — دیوانے کبھی صید اوہام نہیں ہوتے

ہے کون جو دیکھے گا واصف کی مصیبت کو
جلوے غم الفت کے یوں عام نہیں ہوتے

(۱۲۶)

مسرت کے لئے یہ سعی بے حاصل کہاں تک ہے — یہ خامی میرے عزم زیست میں حائل کہاں تک ہے
عنایت ہو مگر تسکین کے قابل کہاں تک ہے — تری صہبا میں تلخی و ساقی محفل کہاں تک ہے
گلوں کے رنگ و بو پر دل ترا مائل کہاں تک ہے — قیام اس گلشن ہستی میں اے غافل کہاں تک ہے
یہ پروانہ وفا عشق میں کامل کہاں تک ہے — ادھر دیکھو ہماری احتیاط دل کہاں تک ہے
یہ موجیں بار بار اٹھتی ہیں طاقت آزمائی ہیں — ہمیں بھی دیکھنا ہے ہمت ساحل کہاں تک ہے
نہ تھا یہ مسئلہ میرے لئے کچھ غور کے قابل — کہ یہ میری وفا انعام کے قابل کہاں تک ہے
کرم ہے یاد فرمایا ہے مجھ کو آپ نے لیکن — مری دیوانگی شایستۂ محفل کہاں تک ہے
تامل کر ذرا جانے سے پہلے ان کی محفل میں — کہ تیرا حوصلہ دیدار کے قابل کہاں تک ہے
پہنچ کر سرحد منزل پہ کیوں شاداں ہے اے رہرو — ابھی تو دیکھنا ہے وسعت منزل کہاں تک ہے
مرے سوز نہاں سے ہے تجھے اے شمع کیا نسبت — یہ تابانی تری اے زینت محفل کہاں تک ہے
یہ کشت آرزو ہے جس کا حاصل کچھ نہیں ہوتا — ذرا دیکھو کہ دل کو حسرت حاصل کہاں تک ہے
جھکا جاتا ہے سورج صبح نو کی پیشوائی کو — شہیدان ستم کی نیند اے قاتل کہاں تک ہے

قدم رکھا تو ہے میخانۂ الفت میں اے واصف
مگر یہ جرعۂ غم ضبط کے قابل کہاں تک ہے

(۱۲۷)

کسی کے گیسوؤں کی برہمی دیکھی نہیں جاتی — صبا ہم سے یہ تیری دل لگی دیکھی نہیں جاتی

خدا کے واسطے اپنے کیے پر تم نہ پچھتاؤ — کہ ہم سے حسن کی شرمندگی دیکھی نہیں جاتی

دکھاؤں کیا تمھیں دل پر جو میں نے چوٹ کھائی ہے — کسک ہوتی تو ہے لیکن کبھی دیکھی نہیں جاتی

یہ دنیا ہے یہاں مکر و دغا کی قدر ہوتی ہے — ہنرمندوں کی شان بوذری دیکھی نہیں جاتی

ترے بندوں کے ناموس و حیا کو آزمانے میں — خدایا اب تو بیچارگی دیکھی نہیں جاتی

یہ میخانہ ہے ہر اک کو بقدر ظرف ملتی ہے — کسی کی خواجگی و بندگی دیکھی نہیں جاتی

بنایا خوگر تسلیم کچھ ایسا محبت نے — کہ اب دشمن کی بھی آزردگی دیکھی نہیں جاتی

مرا دل دیکھنے ہو دل کی آنکھیں کھول کر دیکھو — کہ ان آنکھوں سے دل کی روشنی دیکھی نہیں جاتی

حقیقت کیا ہے ان بکھرے ہوئے سے چار تنکوں کی — یہ حیثیت بھی اللہ غنی دیکھی نہیں جاتی

ہزاروں دل لگا کر جان دے کر ہو گئے رخصت — مگر اس بزم میں کوئی کمی دیکھی نہیں جاتی

اگر ہے چشم تر آصف تو بیڑا پار ہے تیرا
حضور دوست میں تردامنی دیکھی نہیں جاتی

(۱۲۸)

ہے تمھارے نام سے کامل مرا اسلام بھی — بعد مردن مجھ سے پوچھیں گے تمھارا نام بھی

ماہرو ساقی بھی ہے لبریز صہبا جام بھی — سامنے خورشید کے روشن ہے ماہ تمام بھی

ہے ہجوم یاس و حرماں غم بھی ہیں آلام بھی — کس قدر ہمت شکن ہے عاشقوں کی شام بھی

دوستو! کاندھوں پہ لے کر تم کہاں تک جاؤ گے — اس مسافر کے لئے لازم ہے کچھ آرام بھی

جھوم جاتا ہے مرا دل تلخ گوئی پر تری — ربط پنہاں گر نہ ہو ملتی نہیں دشنام بھی

بے عمل کیا ہوں گے ناکامی سے لذت آشنا — کام والے ہی کبھی ہو جاتے ہیں ناکام بھی

کیسی کیسی مجھ پہ ہوتی ہیں خیال آرائیاں — کس قدر سنجیدہ ہے میرا جنون خام بھی

اپنا اپنا ہے مقدر اپنی اپنی ہے نگاہ — سیکڑوں پردے بھی ہیں اور ہے تجلی عام بھی

مل گیا کعبے میں جا کر بادۂ وحدت کا جام — لذت سجدہ سے واقف ہو گئے اصنام بھی

سارے حربے ہو چکے میرا تقاضا کم نہیں
مجھ سے عاجز آ گئی ہے گردشِ ایام بھی

کارزارِ عشق کی دشواریاں واصف نہ پوچھ
جان بھی ہم نے گنوائی اور رہا الزام بھی

(۱۲۹)

تیر کھا کر کبھی بسمل نہیں ہونے پاتے
ہم کبھی ضبط سے غافل نہیں ہونے پاتے

بے گمانی میں جو کامل نہیں ہونے پاتے
منصبِ عشق کے قابل نہیں ہونے پاتے

سازِ ہستی کے جو کچھ تار سنوارے ہم نے
وہ بھی مضراب کے قابل نہیں ہونے پاتے

حادثے دل پہ کچھ ایسے بھی گزر جاتے ہیں
قصۂ غم میں جو شامل نہیں ہونے پاتے

قابلِ داد ہے ہمت ترے دیوانوں کی
ناتوانی میں بھی کاہل نہیں ہونے پاتے

معرفت نقشِ قدم کی نہ میسر ہو جنھیں
کچھ بھی ہوں رہبرِ منزل نہیں ہونے پاتے

میرے بازو جو مہمات میں قاصر نہ رہے
ان کی گردن میں حمائل نہیں ہونے پاتے

صیقلِ عشق سے جس کو نہ جلا ملتی ہو
وہ کبھی جوہرِ قابل نہیں ہونے پاتے

چشمِ ساقی کا ہے فیضان یہ ہم پر واصف
غم کے آداب سے غافل نہیں ہونے پاتے

(نوٹ، ردیف اہلِ دہلی کے محاورے کے خلاف ہے۔ مگر طرحی غزل ہے۔ واصف)

(۱۳۰)

یہیں ہم نے اشک بہائے تھے یہیں خونِ دل بھی گرا گئے
تری جستجو میں ہم آئے تھے تری رہگذر کو سجا گئے

وہ مجاہدانِ رہِ وفا جو وجود اپنا مٹا گئے
کبھی آندھیوں سے نہ بجھ سکا جو چراغ راہ جلا گئے

دمِ صبح جھونکے نسیم کے شبِ غم کی شمع بجھا گئے

شب غم کی شمع کا سوز بھی مجھے دے کے اور جلا گئے
کبھی کائنات پہ چھا گئے کبھی میرے دل میں سما گئے
یہ نمود حسن کے معجزے مجھے کشمکش میں پھنسا گئے
جو تمھیں کبھی نہ بھلا سکے جنھیں آج تم نے بھلا دیا
انھیں ڈھونڈھتے ہی پھروگے تم کبھی یاد تم کو جو آ گئے
کبھی ان کے رخ پہ نظر گئی کبھی آہ جانب در گئی
کہوں کیا جو دل پہ گزر گئی جو وہ ہو کے مجھ سے خفا گئے
پس مرگ بھی نہ سکوں ملا وہی ان کا جور و ستم رہا
کبھی اس طرف جو گزر ہوا تو لحد کی خاک اڑا گئے
مری ناتوانی کا ہو برا کہ میں کارواں سے بچھڑ گیا
ہوئی مجھ سے ایسی بھی کیا خطا کہ نشان پا بھی مٹا گئے
ہوئے وہ جو سامنے جلوہ گر تو کہانی ہو گئی مختصر
نہ ملی تھی فرصت یک نظر کہ مری نظر میں سما گئے
بڑی احتیاط سے ہم رہے مگر ان کی محفل ناز میں
کبھی موٗنھ سے آہ نکل گئی کبھی اشک آنکھوں میں آ گئے
نہ ہوا علاج مریض غم وہی بیکسی رہی چشم نم
یوں ہی دن خزاں کے چلے گئے یوں ہی دن بہار کے آ گئے
مجھے راس کب تھی کوئی خوشی مجھے غم نے آ کے پناہ دی
اسی وقت آنکھ بھی نم ہوئی وہ کبھی جو آ کے ہنسا گئے
کوئی نغمہ مطربِ خوش نوا کوئی جرعہ ساقیٔ خوش ادا
یہ ستم یہ فتنے یہ حادثے دل مبتلا کو تھکا گئے

ترا دم بھی واصف خوش قدم ہجوم یاس ہے مغتنم
گئے واقفانِ رموزِ غم تو بساطِ غم بھی اٹھا گئے

(۱۳۱)

ہمتِ عالی سے بے محروم دیوانہ ابھی
خون کے چھینٹوں سے خالی ہے یہ افسانہ ابھی

بے نیازانہ تمناؤں کے گلشن سے گزر
دور ہے حدِ نظر سے دل کا ویرانہ ابھی

خوبیٔ قسمت سے آزادی کی دیوی مل گئی
اس کی زلفوں کو مگر ہے حاجتِ شانہ ابھی

سوزِ غم سے آب آجانے دو اشکوں پر مرے
طائرِ مقصود کے لائق نہیں دانہ ابھی

بادۂ عرفانِ الفت کس کو ہوتا ہے نصیب
تلخیٔ دوراں سے خالی ہے یہ پیمانہ ابھی

آؤ پیرِ میکدہ کے ہاتھ پر بیعت کریں
کچھ یہاں باقی ہیں اخلاقِ کریمانہ ابھی

پاؤں ہیں واصف کے زخمی اور دل ٹوٹا ہوا
ہے عیاں نظروں سے لیکن عزمِ مردانہ ابھی

(۱۳۲)

ملنے ہو کسی اور سے شک ہے تو یہی ہے
اے دوست مرے دل میں کھٹک ہے تو یہی ہے

کو دیتا ہے رہ رہ کے مرا داغِ تمنا
ظلمت کدۂ دل میں چمک ہے تو یہی ہے

تیرِ نگہ دوست کے قابل نہیں نکلا
اس آبلۂ دل میں ٹپک ہے تو یہی ہے

حوروں کے تصور میں ہے دنیا سے گریزاں
زاہد کو اگر کوئی لٹک ہے تو یہی ہے

خودداریٔ فطرت سے ہوں عالم میں سرافراز
مجبورِ محبت ہوں لچک ہے تو یہی ہے

ہے موتھ ہیں زباں دل میں مضامین کے انبار
نازک ہے مزاج ان کا جھجک ہے تو یہی ہے

عسرت میں نہ چھوٹے کبھی دامانِ تحمل
انسان کی عظمت کی محک ہے تو یہی ہے

ہے پاک ریاکاریٔ و تلبیس سے باطن
چہرے پہ قلندر کے دمک ہے تو یہی ہے

نازاں ہوں میں واصف کہ مجھے دوست نے مارا
غیروں کی رہی بات کھٹک ہے تو یہی ہے

(۱۳۳)

مجھے جام مے جو عطا ہوا یہ تری نوازش عام ہے
مجھے اک نظر سے نواز دے کہ جنوں مرا ابھی خام ہے
تجھے ابتدا کی خبر نہیں تجھے انتہا میں کلام ہے
تو سمجھ رہا ہے کہ زندگی یہی صبح ہے یہی شام ہے
کسی رہنما کا نہ کر گلہ ترا عزم ہی ابھی خام ہے
جو سنبھل سنبھل کے بڑھا چلے وہی رہنما ہے امام ہے
تری جستجو میں چلا تھا میں مجھے ہست و نیست کی کیا خبر
یہ مقام کونسا آگیا نہ سفر ہے اب نہ قیام ہے
یہ ہمارے عشق کا ارتقا کہ نکھر نکھر کے نظر میے
نہ سوال ہے نہ جواب ہے نہ کلیم ہے نہ کلام ہے
سر راہ رات کو محتسب جو ملا نشے میں تو یہ کھلا
یہ جو چھپ کے مے تو حلال ہے کوئی دیکھ لے تو حرام ہے
ہو ملیں گر چہ لاکھ شکایتیں نہ سنیں کسی کی ہدایتیں
ہوئے آج ایسے وہ اجنبی نہ سلام ہے نہ کلام ہے
کہے کیا یہ واصف بینوا کہ ہے زندگی کا نظام کیا
وہی داغ ہجر کی تابشیں وہی اختر سر شام ہے

(۱۳۴)

تجھے مستعار اس نے دی ہے یہ دولت یہ اعزاز و منصب یہ کاخ اور حویلی

نہ لاؤ کبھی لب پہ حرف شکایت اگر اس نے واپس کوئی چیز دے لی
زمانے میں لاکھوں ہوئے اہل حکمت نہ بوجھی کسی نے مگر یہ پہیلی
کہ بن دیکھے ہوتی ہے کیونکر محبت مصیبت یہ کیا میں نے سر اپنے لے لی
ہوئے ہم کسی کے نہ مرہون منت عطا کی خدا نے ہمیں ایسی ہمت
اگر ناخدا نے کبھی کی ہے غفلت تو کشتی بھی خود اپنے ہاتھوں سے کھیلی
بہت ہی کٹھن ہے یہ راہ محبت یہاں کیا نبا ہے گا کوئی رفاقت
ہوا چاہتی ہے جوانی بھی رخصت یہی ہے جو برسوں مرے ساتھ کھیلی
سنی عمر بھر یہ پرانی کہاوت کہ ہوتی ہے تکلیف کے بعد راحت
نہ نکلی مگر آج تک کوئی حسرت الم بھی اٹھائے مصیبت بھی جھیلی
نہیں زال دنیا سزاوار الفت یہ دنیا ہے اے دل بڑی حیلہ خصلت
دکھاتی ہے ہر دم نئی شکل و صورت کرشمے نرالے ادائیں نویلی
لیا چھوڑ کر گھر کو صحرا ئے وحشت کھلاتی رہی ٹھوکریں ہم کو قسمت
پس مرگ آخر پئے استراحت ملی صاف ستھری منور حویلی
نسیم سحر سے ہے مجھ کو شکایت نہ لائی کبھی ان کی زلفوں کی نکہت
مرے دل کو ڈستی ہے ناگن کی صورت بنی پھرتی ہے بوئے گل کی سہیلی
ہوا تھا میسر وہ کیف محبت کہ حاصل تھی ہر دم تمھاری رفاقت
تمھاری خوشی میں ہے آصف کو راحت اگر جا رہے ہو تو اللہ بیلی

(۱۳۵)

مانا کہ تمھیں ہم سے کوئی بیر نہیں ہے — غیروں کی مگر بات کا سر پیر نہیں ہے
ہے دل میں جو ارمان تو ہے وہ بھی تمھارا — آجاؤ کہ اس گھر میں کوئی غیر نہیں ہے
بدلا تو ہے انسان نے دنیائے کہن کو — بدلی ہوئی دنیا میں بھی کچھ خیر نہیں ہے

ہے جوش عمل غم میں تو کافی ہے یہی عمر — دوڑو تو زمانہ بھی سبک سیر نہیں ہے

کھلتا ہے یہاں آ کے ہر اک شخص کا کردار
میخانہ ہے واصفؔ حرم و دیر نہیں ہے

(۱۳۶)

جو کسی راز داں کا جیا ہے — اس نے اپنا وقار کھویا ہے
اپنے عاشق کا حال ہم سے نہ پوچھ — عمر بھر تیرے غم میں رویا ہے
ضبط کرتے تو کچھ بنی رہتی — آنسوؤں نے ہمیں ڈبویا ہے
کیوں جگاتے ہو بخت خفتہ کو — روتے روتے ابھی تو سویا ہے
دل میں ہے آج تک کھٹک پیہم — غم نے کانٹا بھی کیا چبھویا ہے
قتل کے بعد اور یہ دو آنسو — خون کا داغ کس نے دھویا ہے
یہ جوانی بھی خوب کام آئی — اینٹ پتھر ہی ہم نے ڈھویا ہے
دل مردہ کا سوگ ہے کب تک — عمر بھر کون کس کو رویا ہے

ہائے واصفؔ کا خون کر ڈالا
کیسا انسان غم نے کھویا ہے

(۱۳۷)

ہجوم جلوہ میں جلوے سے بے نیاز رہے — وہ زندہ دل ہے نظر جس کی پاکباز رہے
مزائے عشق میں دار و رسن نصیب ہوا — خوشا نصیب کہ ہم یوں بھی سرفراز رہے
نہ چھوڑ صبر و قناعت کو بے نوائی میں — غنی وہی ہے جو دنیا سے بے نیاز رہے
سحر قریب ہے انجام آرزو معلوم — شب فراق تری زندگی دراز رہے
خلوص اہل وفا کا مآل کیا ہوگا — اگر فریب کی رسی یونہیں دراز رہے
غنی کی روح بھی ہوتی ہے کس قدر مسرور — اگر فقیر کا دست طلب دراز رہے

ملامتیں بھی ہیں آزار بھی ہیں اے واصف
مگر جو راز ودیعت ہوا وہ راز رہے

(۱۳۸)

بس اک نظر میں ہی دل دے دیا ہے چل جھوٹے
فریب تو نے بھی اچھا کیا ہے چل جھوٹے

یہ خوش کہ میں نے ترا دل لیا ہے چل جھوٹے
بلا سبب مجھے رسوا کیا ہے چل جھوٹے

کسی نے تیر بھی مارا ہے تیرے سینے میں
نگاہ ناز نے زخمی کیا ہے چل جھوٹے

تمام رات تجھے نیند بھی نہیں آئی؟
ستارے گن کے سویرا کیا ہے چل جھوٹے

کسی کی چاہ میں یوں جان کون دیتا ہے
پیالہ زہر کا تو نے پیا ہے چل جھوٹے

یہ کیسا عشق کہ دم بھر میں جان رخصت ہے
مگر فراق میں برسوں جیا ہے چل جھوٹے

کہا جو اس سے تجھے دل میں رکھ لیا میں نے
کہا کہ دل میں مجھے رکھ لیا ہے چل جھوٹے

کہا کہ دل میں نہیں کوئی اب تو آجاؤ
تو بولے دل میں ترے تخلیہ ہے چل جھوٹے

یہ دختِ رز سے ترا اجتناب اے واصف
بہ خوب تو نے ہمیں چکمہ دیا ہے چل جھوٹے

(۱۳۹)

ہر گلی کوچے میں اک ہنگامہ دیکھا جائے ہے
تو جدھر جائے قیامت ہی ادھر آجائے ہے

بات کچھ ہوتی ہے مطلب اور سمجھا جائے ہے
میں جو کچھ کہتا ہوں ظالم سے تو شرما جائے ہے

کیا ہے پروانے کی ہستی اور کیا ہے اس کا ظرف
حسن کی آنکھوں میں آنسو کس سے دیکھا جائے ہے

چوٹ کھانے ہی سے شرر ہوتا ہے پیدا سنگ سے
دو جہاں کا غم کہیں پتھر سے کھایا جائے ہے

کیا غضب ہے یوں نگاہ ناز کی توہین ہو
آج مقتل میں ترے مجرم کو لایا جائے ہے

آؤ واعظ سے ہم اک دستار کا سودا کریں
آہ! اس دنیا میں ظاہر ہی کو دیکھا جائے ہے

اپنی دولت اور حشمت کیا دکھاتا ہے ہمیں
دیکھنا یہ ہے کہ تیرے ساتھ کیا کیا جائے ہے

مشکلات عشق کو آسان کرنا ہے جنون
اس مصیبت کو بھلا یوں کس سے جھیلا جائے ہے
دشمنوں کی حرف گیری سے نہ ہو واصفؔ ملول
نقد دل بازار رسوائی میں پرکھا جائے ہے

(نوٹ، ردیف محاورۂ متروکہ ہی سہی ہے۔ مگر طرحی غزل ہے۔ اس لئے معذوری ہے۔ واصف)

(۱۴۰)

ہوائے یاس و حرماں سے دلِ سوزاں لرزتا ہے
چراغ راہرو جیسے تہِ داماں لرزتا ہے
تری کافر جوانی سے مرا ایمان لرزتا ہے
تب صحرا سے گویا قطرۂ باراں لرزتا ہے
کہانی اپنی کس عنوان سے اس کو سناؤں میں
کہ دردانگیزیٔ مضمون سے عنواں لرزتا ہے
امنگیں تھیں تو دل میں تیرے غم کی میہمانی تھی
مگر اب گھر کو ویراں دیکھ کر مہماں لرزتا ہے
پناہِ سازوساماں دستِ رعنا ہے تو نگر کا
قلندر کے تصرف سے سرِ سلطاں لرزتا ہے
تمناؤں کو اے داغو! ذرا جا کر منالاؤ
کہ اس کی بے نیازی سے دلِ ویراں لرزتا ہے
لطافت میں نسیمِ صبح سے میں کم نہیں لیکن
مرے نزدیک آ کر وہ گلِ خنداں لرزتا ہے
کچھ ایسے زخم پہنچائے ہیں قاتل نے معاذ اللہ
کہ آغوشِ لحد میں بھی تنِ بے جاں لرزتا ہے
مجھے آزاد کر کے کس لئے ممنون کرتے ہو
نگاہِ لطف سے کبھی بندۂ احساں لرزتا ہے
گدازِ سوزِ الفت سے وہ آنسو بن گیا جل میں
جو تابِ روئے جاناں سے سرِ مژگاں لرزتا ہے
بگوشِ دل سنو سازِ وفا کی نغمہ آرائی
ہر اک تارِ نفس با صد مۂ پنہاں لرزتا ہے
غضب ہے کتنے ارمانوں کا تو نے خون کر ڈالا
تری عادت سے اب تو موت کا ارماں لرزتا ہے
ہوا ہے اُنس ہر مخلوق یہ انسان اے واصفؔ
مگر انسان کو اب دیکھ کر انسان لرزتا ہے

(۱۴۱)

وائے ناکامی کہ وہ مجھ سے کشیدہ ہو گئے
جن سے رونق تھی وہ فتنے آرمیدہ ہو گئے

رائگاں رندوں کے اوصافِ حمیدہ ہو گئے
بوالہوس ان کی نظر میں برگزیدہ ہو گئے

وقتِ رخصت اضطرابِ دل کی حالت الاماں
دیکھ کر مجھ کو وہ خود بھی آبدیدہ ہو گئے

میرے افسانوں سے دنیا نے لیا درسِ جنوں
میرے افسانے بھی اب تو ناشنیدہ ہو گئے

سرو قدانِ چمن پر آہ! یہ گزری ہے کیا
بارِ آزادی سے شمشیر خمیدہ ہو گئے

بتکدے کی راہ لی تھی چھوڑ کر بابِ حرم
میری قسمت سے یہ آہو بھی رمیدہ ہو گئے

اک کرن بن کر تری محفل کو گرمائے گا کون
تیرے در سے ہم اگر دامن کشیدہ ہو گئے

عمر بھر کس کس طرح ہم نے چھپائیں حسرتیں
آج تربت پر گل و ریحاں دمیدہ ہو گئے

میرے بال و پر سے تو گردوں کو تھا مدت سے بیر
ہم صفیرانِ چمن کیوں پر بریدہ ہو گئے

گرم ہو جاتا تھا جن سے نوجوانوں کا لہو
آج وہ اذکار مضمونِ قصیدہ ہو گئے

قطرہ ہائے خونِ دل کا کیا کہوں واصفؔ مآل
وقف وہ بھی صورتِ اشکِ چکیدہ ہو گئے

(۱۴۳)

مائل مری جانب نگہِ ناز نہیں ہے
اس بزم میں شاید کوئی غماز نہیں ہے

فریاد نہیں نغمہ نہیں ساز نہیں ہے
کیفیتِ دل کی کوئی آواز نہیں ہے

آنسو بھی نہ ٹھہرا تپشِ غم کے مقابل
افسوس کہ دل کا کوئی ہمراز نہیں ہے

دل ہی تو ہے ہر ایک کا یکساں نہیں ہوتا
وہ چشمِ فسوں گر غلط انداز نہیں ہے

کیا پوچھتے ہو اس نگہِ ناز کا عالم
اک نغمہ ہے لیکن کوئی آواز نہیں ہے

اک عمر کے بعد آج بہار آئی ہے لیکن
گل بیز و گہر ریز و چمن ساز نہیں ہے

کہتا ہے قفس میں یہ مرا ذوقِ اسیری
تھم جا کہ ابھی طاقتِ پرواز نہیں ہے

ہے اور ہی کچھ بات کہ افسردہ ہوں اے چرخ!
گردش تری مجھ پر اثر انداز نہیں ہے

یہ عشق ہے واصف یہ چھپائے نہیں چھپتا
تم راز سمجھتے ہو اسے ، راز نہیں ہے

(۱۴۳)

عزت انھیں ملی وہی آخر بڑے رہے
جو خاک ہو کے آپ کے در پر پڑے رہے

اے دوست مغتنم ہیں وہ مردان باوقار
عسرت میں بھی جو آن پہ اپنی اڑے رہے

پایاب ہو کے سیل نے ان کے قدم لیے
منجھدھار میں جو پاؤں جمائے کھڑے رہے

پڑتی نہیں ہر ایک پہ اس کی نگاہ ناز
ساقی کے آستاں پہ ہزاروں پڑے رہے

داغوں سے آبلوں سے مرصع رہا ہے دل
سب کچھ لٹا مگر یہ نگینے جڑے رہے

اپنوں کی تلخ گوئی کی لذت نہ پوچھیے
بھالے سے عمر بھر رگ جاں میں گڑے رہے

پہنچا نظر سے دور ستاروں کا قافلہ
ہم انتظار صبح میں غافل پڑے رہے

مانند سنگ میل دکھائی ہر اک کو راہ
لیکن خود اپنے پاؤں زمیں میں گڑے رہے

بعد فنا بھی حسرت دیدار تھی ہمیں
مانند نقش پا سر راہے پڑے رہے

ظالم سے ایک بوسے پہ برسوں رہی ہے ضد
آخر تک اپنی بات پہ ہم بھی اڑے رہے

شاید کہ ملتفت ہو کوئی شہسوار ناز
کس آرزو سے ہم سر منزل کھڑے رہے

فتنے بہت ہیں بتکدہ و خانقاہ میں
اچھے رہے جو دشت جنوں میں پڑے رہے

واصف کا انتظار تھا صحرا میں بعد قیس
کانٹے بھی مدتوں یونہیں پیاسے پڑے رہے

(۱۴۴)

مانگو جو مانگنا ہو اپنے ہی رب سے پہلے
دے گا وہی دیا ہے جس نے طلب سے پہلے

ساغر دیا ہے تو نے دشمن کو سب سے پہلے
ساقی نہ تھا یہاں یہ دستور اب سے پہلے

بیگانگی مٹا دو بزم طرب سے پہلے
ساغر ذرا لگا دو ناصح کے لب سے پہلے

اے ہم سفر ٹھہر جا عبرت کی کھول آنکھیں
دیکھا تو ہو گا تو نے حق کو اب سے پہلے

جا نامہ بر خدارا ہو خیر تیرے دم کی
میرا اسلام کہیو جا کر ادب سے پہلے

دست سوال کیونکر نکلے گا آستیں سے
نم ہو گئی ہیں آنکھیں عزم طلب سے پہلے

کچھ تو بتا منجم ! کیا پھر بھی وہ ملیں گے
ٹوٹا تھا اک ستارہ آغاز شب سے پہلے

شعر و سخن بھی ہو گا بزم طرب بھی ہو گی
تھم جاؤ بات کر لیں بنت عنب سے پہلے

پہلے سے کیا خبر تھی رسوائی ایسی ہو گی
کیا دن وہ تھا کہ تم کو دیکھا تھا سب سے پہلے

اے چارہ ساز تجھ سے کیا اپنا حال کہتے
واقف نہیں تھے ہم بھی غم کے سبب سے پہلے

یہ وصل کا زمانہ ہے تیز گام کتنا
آثار ہیں سحر کے انجام شب سے پہلے

معذور ہم کو سمجھو گر بھیگ جائیں پلکیں
کب آشنا تھے ایسے رنج و تعب سے پہلے

واصف کو اب نہ ڈھونڈھو تم کھو چکے یہ دولت
کچھ بھی نہ تم نے سوچا غیظ و غضب سے پہلے

(۱۴۵)

جو خدنگ ناز کے کارواں یونہیں بار بار رواں رہے
تو کہو کہ دل کو کہاں اماں یہ گناہ گار کہاں رہے

مرے راز گریہ و آہ سے سر رہگذار عیاں رہے
یہ غضب کہ تیری نگاہ سے مرا حال زار نہاں رہے

کبھی میکدہ کبھی گلستاں بدل نگار رواں رہے
نہ بلی الم سے ہمیں اماں رہے بے قرار جہاں رہے

یہ مصافحے یہ معانقے یہ خلوص دل کے مظاہرے
کبھی ہم اسیر بلا ہوئے تو یہ جاں نثار نہاں رہے

کبھی تخت قیصر و تاج کے کبھی عشق و رندی و جام مے

یہ تری نگاہ کا فیض ہے رہے باوقار جہاں رہے
ہوا راہ عشق میں سر قلم نہ ہٹایا پیچھے مگر قدم
ترا دم جو بھرتے تھے دم بدم وہ وفا شعار کہاں رہے
یہ سمجھ لے گردش آسماں ترے داؤ پیچ ہیں رائگاں
غم یار دل میں لئے ہے یہاں غم روزگار کہاں رہے
رہے ہم شمار نفس میں گم نہ سنی کہیں سے صدائے غم
یہ بتاؤ بہر خدا کہ تم شب انتظار کہاں رہے
نہ حزیں ہو آصف خوش نظر جو گئی جوانی تو غم نہ کر
کہ ہے زندگی کا مزہ اگر دل داغدار جواں رہے

(۱۴۶)

پڑے دیکھے ہیں لاشے تو نے بے گور و کفن کتنے
تری خوئے تغافل نے اجاڑے ہیں چمن کتنے
بڑا سخت امتحاں ہے آج مومن کی فراست کا
کہ بن ٹھن کر تنے بیٹھے ہیں صدر انجمن کتنے
یہاں تک تو جنون عشق نے ہمت نہیں ہاری
خدا جانے کہ آگے مرحلے اب ہیں کٹھن کتنے
ابھی نکلے نہیں ہیں پیچ و خم زلف برہمن کے
پڑے خاک وطن پر لوٹتے ہیں بے وطن کتنے
یہ غمزے یہ ادائیں اپنی بس رہنے دے اے دنیا
کیے ہیں تو نے شوہر سچ بتا اے پیرزن کتنے
ذرا جب مال دنیا ہے رعونت آہی جاتی ہے
انھیں آنکھوں نے دیکھے دوستوں کے بانکپن کتنے
عزیمت اور توکل ہی سہارا ہے غریبوں کا
بتا اے دل یہاں ہیں مستشار مؤتمن کتنے
جمال خوبرویاں ضامن ناموس آدم ہے
مگر عشاق ہیں پابند آئین کہن کتنے
ذرا دیکھو تو گوشے سے نکل کر حضرت آصف
مناظر آج ہیں پیش نظر توبہ شکن کتنے

(۱۴۷)

ابھی ایجاد ہوں گے دیکھیے طرزِ سخن کتنے
ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے بدلے چلن کتنے

نہ کھینچی تیغ براں اور بسمل کر دیا مجھ کو
بایں معصومیت قاتل کو بھی آتے ہیں فن کتنے

ترے دو چار اشکوں سے ادا کیا خوں بہا ہوگا
بھرے ہیں شمع! جانبازوں کی لاشوں سے لگن کتنے

اگر اس نے نظر ہم کو نہ دی ہوتی تو لٹ جاتے
ملے ہیں بھولی بھالی صورتوں میں راہزن کتنے

غنیمت تھی وہی بے آگہی و ابلہی اپنی
خدا جانے مجھے دکھلائے گا یہ علم و فن کتنے

بس اتنا ہی کہا تھا، "ہم وفاداروں میں ہیں تیرے"
ذرا سی بات پہ محفل میں بگڑے ہیں دہن کتنے

کہیں ان چونچلوں سے دولتِ دیدار ملتی ہے
گریباں چاک دامن چاک دیکھے پیرہن کتنے

نہ ہوتا گر ہمیں حاصل گدازِ غم تو کیا ہوتا
جو پیش آئے ہمیں وہ حادثے تھے دل شکن کتنے

چلا ہے لے کے داصفؔ آج لشکر آرزوؤں کا
ہمیں بھی دیکھنا ہے تم ہو آخر صف شکن کتنے

(۱۴۸)

دن کا تجسس راتوں کے نالے کچھ بھی ہمارے کام نہ آئے
بھولا کہیں ہم تم کو نہ کیونکر صبح گئے تھے شام نہ آئے
جنس ہی اپنے پاس تھی کھوٹی کیا ہو گلہ گر دام نہ آئے
شکر کہ اس نے لے تو لیا وہ دل جو کسی کے کام نہ آئے
بھول گئے ہیں اہلِ زمانہ میری فضیحت کا وہ فسانہ
وقت کا اب تو یہ ہے تقاضا ان کا کوئی پیغام نہ آئے
وقت گزر ہی جاتا ہے آخر بات گرہ جاتی ہے دل میں
یاد ہیں وہ بھی دوست ہمیں جو وقت پڑے پہ کام نہ آئے
بیت گئی کیا ہجر میں ہم پر یاد ہماری تم کو نہ آئی

ہم تو پڑے تھے بستر غم پر تم بھی فراز بام نہ آئے

کتنی امیدیں لے کے چلا ہوں اب تو کرم ہو اے مرے ساقی

تیرا در ہے کوئی بھی جائے لوٹ کے وہ ناکام نہ آئے

خواہش راحت لے گئی ہم کو دشت جنوں سے ملک عدم کو

جائے کہاں وہ غم زدہ جس کو قبر میں بھی آرام نہ آئے

کاش کہ آئے تجھ پہ ستمگر میری طرح اک غم کا زمانہ

رات وہ جس کی صبح نہ آئے صبح وہ جس کی شام نہ آئے

آج تو آصف ان کو سنا دو ایک کہانی عشق و وفا کی

ایسا رہے انداز تکلم حال کھلے اور نام نہ آئے

(۱۴۹)

بیاں اے ہم نشیں! غم کی حکایت اور ہو جاتی — ذرا ہم خستہ حالوں کی طبیعت اور ہو جاتی

نصیحت حضرت واعظ کی سنتے بھی تو کیا ہوتا — یہی ہوتا کہ ہم کو ان سے وحشت اور ہو جاتی

بس اک ٹھوکر کی حسرت تھی ہماری خاک تربت کو — دم سیر چمن اتنی سی زحمت اور ہو جاتی

مدوائے خون دل اشکوں نے ہمت ہار دی آخر — کسی صورت سے دامن کی ضیافت اور ہو جاتی

ستم آفت مصیبت ابتلا ایذا رسوائی — بس اب دم آخر شہادت اور ہو جاتی

سر محشر سنا دی اپنی ساری داستاں میں نے — جو ایسے میں وہ آ جاتے تو صورت اور ہو جاتی

در پیر مغاں پر اور رہنے دو ابھی مجھ کو — بجان ناتواں تھوڑی سی خدمت اور ہو جاتی

بہت اچھا ہوا آنسو نہ نکلے میری آنکھوں سے — بپا محفل میں اک تازہ قیامت اور ہو جاتی

تڑپ کر دل نے منزل پر مجھے چونکا دیا ورنہ — خدا جانے کہ طے کتنی مسافت اور ہو جاتی

تمہارے نام سے ہے بیکسوں کا نام وابستہ — بلا لیتے اگر در پر تو نسبت اور ہو جاتی

زباں کچھ کھولتے تم بھی عدو کی ہمنوائی میں
مزہ کچھ اور ہو جاتا حلاوت اور ہو جاتی

مجھے اپنی کہانی رازداں کہنے نہ دی تو نے
حرج کیا تھا اگر تھوڑی سی ذلت اور ہو جاتی

بہت سستے رہے نیچی نظر سے دل لیا تم نے
اگر نظریں بھی مل جاتیں تو قیمت اور ہو جاتی

شرف بخشا ہے تم نے آج مجھ کو ہم کلامی کا
کہوں کچھ دل کی بات اتنی اجازت اور ہو جاتی

زہے قسمت نوازا ہے جواب خط سے واصف کو
دکھانے اک جھلک اتنی عنایت اور ہو جاتی

(۱۵۰)

جانتا ہوں کہ بخت برہم ہے
پھر بھی جینے کا عزم محکم ہے

عاجزی سے خطا کرم ہے
یہ تنزل عروج آدم ہے

بدگماں کس نے کر دیا تم کو
خیر تو ہے مزاج برہم ہے

آسرا ہے تری توجہ کا
سامنے ہے بھنور تو کیا غم ہے

آج کیوں ہے یہ پرسش پنہاں
تیرا احسان یوں بھی کیا کم ہے

امڈے آتے ہیں پے بہ پے آنسو
شام فرقت کا خیر مقدم ہے

ہائے بیچارگی اہل وفا
اک زمانے سے آنکھ پرنم ہے

کیا کروں شرح واردات فراق
عشق ہی خود ابھی تو مبہم ہے

ڈھونڈو اشکوں میں مدعا دل کا
میری ہر آرزو مجسم ہے

نہ سمجھنا حقیر تم مجھ کو
میرا استاد ابو المعظم ہے

ساغر دل چھلک گیا واصف
اب تو خطرے میں سارا عالم ہے

(۱۵۱)

حریم ناز کو ہم عنبر کی محفل نہیں کہتے
رقیبوں پہ مگر وہ کون تھا مائل نہیں کہتے

جو رنج عشق سے فارغ ہو اس کو دل نہیں کہتے
جو موجوں سے نہ ٹکرائے اسے ساحل نہیں کہتے

اشارہ شمع کا سمجھا نہ پروانہ تو کیا سمجھا
منارِ راہ کو اہلِ نظر منزل نہیں کہتے

یا یہی غارتگری منظور اس کی رازداری ہے
ہم اپنے مونھ سے اس قاتل کو کبھی قاتل نہیں کہتے

برنگِ رشتۂ تسبیح دل سے راہ ہے دل کو
بھٹک جائے جو اس جادے سے اس کو دل نہیں کہتے

زلیخا کے وقارِ عشق کو صحرا سے کیا نسبت
جو خود کھنچ کر نہ آجائے اسے منزل نہیں کہتے

مریضِ غم کی غفلت بھی کمالِ ہوشیاری ہے
جو گم ہو جائے جلووں میں اسے غافل نہیں کہتے

بھرم اس کا ہی اے منصور تو نے رکھ لیا ہوتا
کسی کا راز اے ناداں سرِ محفل نہیں کہتے

کرم احباب کا بزمِ سخن میں کھینچ لایا ہے
ہم اپنے آپ کو آصف کسی قابل نہیں کہتے

(۱۵۲)

تری الفت میں جتنی میری ذلت بڑھتی جاتی ہے
قسم ہے ربِ عزت کی کہ عزت بڑھتی جاتی ہے

خدایا خیر ہو معمور ہائے ربعِ مسکوں کی
کہ اب دل کھول کر رونے کی عادت بڑھتی جاتی ہے

ہوئے تم مجھ سے رو گرداں مگر یہ حال ہے میرا
کہ جتنا دور ہوتا ہوں محبت بڑھتی جاتی ہے

کسی کو یاد کر کے ایک دن خلوت میں رویا تھا
نہیں معلوم کیوں جب سے ندامت بڑھتی جاتی ہے

کہاں طاقت سنانے کی کسے فرصت ہے سننے کی
کہ مجمل ہوتے ہوتے بھی حکایت بڑھتی جاتی ہے

کہاں میں اور کہاں تیری نگاہِ لطف اے ساقی
خدا جانے یہ کیوں مجھ پر عنایت بڑھتی جاتی ہے

یہ میرا شیشۂ دل ہے خزف ریزہ نہیں ہمدم
شکستہ جس قدر ہوتا ہے قیمت بڑھتی جاتی ہے

ادھر تحسینِ آرائش کی خواہش حسنِ خودبیں کو
یہاں جذباتِ پنہاں کی حفاظت بڑھتی جاتی ہے

غضب کا جذب ہے آصف نگاہِ مست میں اس کی
منازل قطع ہوتے ہیں عزیمت بڑھتی جاتی ہے

(۱۵۳)

وجہ وفور کلفت احساس و آگہی ہے
اس آگہی کے ہاتھوں کیا جان پر بنی ہے

گو بزم آرزو پر طاری فسردگی ہے
سینے میں اب بھی لیکن اک آگ سی لگی ہے

اس راہ سے گزر جا او سیر کرنے والے
مدت ہوئی کہ دل کی بستی اجڑ چکی ہے

اے عشق خانہ ویراں تیری تباہ کاری
مرنے کی آرزو تھی اب وہ بھی مٹ رہی ہے

محفل میں آکے ہنسنا خلوت میں جاکے رونا
اس زندگی میں ہم پر کیا کیا گزر گئی ہے

ضبط فغاں بھی ممکن صرف نظر بھی آساں
دل کا معاملہ ہے مشکل یہ آپڑی ہے

تنکے کا بھی سہارا دل کو نہیں گوارا
گو زندگی کی کشتی گرداب میں پھنسی ہے

باقی ہے بعد مردن رسوائیِ محبت
مجھ بے نشاں پہ اب بھی بہتان زندگی ہے

واصف سے آبرو تھی دنیائے عاشقی کی
مدت ہوئی کہ ان کی محفل میں برہمی ہے

(۱۵۴)

روح جب قید عناصر میں گرفتار نہ تھی
گرمیِ بزم نہ تھی رونق بازار نہ تھی

آپ کے وعدہ کا شاید مجھے آجائے یقین
تیز اتنی تو کبھی قلب کی رفتار نہ تھی

جستجو میں تری پہنچا ہوں عدم تک اے دوست
ورنہ یہ زیست کچھ ایسی بھی گرانبار نہ تھی

اللہ اللہ بلندی مذاق عصیاں
غیر آدم کوئی مخلوق گنہ گار نہ تھی

ان کو جی بھر کے نہ دیکھا کہ ہوئی صبح فراق
اس قدر تیز کبھی وقت کی رفتار نہ تھی

جسم خاکی نے دیا ساتھ نہ میرا اے دوست
جستجو تیری رہ شوق میں دشوار نہ تھی

بزم دوشیں کا سماں واصف غمگیں سے نہ پوچھ
کونسی آنکھ تھی جو مہبط انوار نہ تھی

(۱۵۵)

آگ حرمانگہ عالم میں لگادے ساقی
یک قلم دفتر ارماں کو جلادے ساقی

توڑ دے جام و سبو بادہ لنڈھادے ساقی
آج نور رخ سے نقاب اپنے اٹھادے ساقی

مے کی تلخی میں حلاوت بھی ملادے ساقی
بیٹھا بیٹھا سا کوئی بول سنادے ساقی

اجنبیت سے مکدر ہے مزاج محفل
لب سے ناصح کے ذرا جام لگادے ساقی

کیا ہوا تھا کوئی پیمان مجھے یاد نہیں
ہاں وہ منظر وہ سماں یاد دلادے ساقی

عقل کم مایہ کجا راہ خرابات کجا
میری ہستی سے یہ بہتان ہٹادے ساقی

آفریں کی در و دیوار سے آتی ہے صدا
اک جنوں خیز قدح اور پلادے ساقی

تلخ سے تلخ پلا اور پلا خوب پلا
ایسی جو ہوش فرشتوں کے اڑادے ساقی

غیرت نشۂ الفت کو گلہ ہے تجھ سے
فتنۂ گردش دوراں سے بچادے ساقی

بجھ نہ جائے کہیں دل صدمۂ ناکامی سے
خون میں آتش سیال کھپادے ساقی

ظرف و تمکین بھی تجھ سے ہے تجھی سے توفیق
لطف تو جب ہے کہ آصف کو چھکادے ساقی

(۱۵۶)

خدا جانے یہ پیہم کون نشتر سے چبھوتا ہے
خوشی کے وقت بھی دل میں ہمارے درد ہوتا ہے

کوئی اس گوشۂ دیوار کی عظمت کو کیا جانے
جہاں کوئی کسی کی یاد میں چھپ چھپ کے روتا ہے

کلی تو مسکرا کر راز پنہاں کھول دیتی ہے
مگر کیا بات ہے دل کی نہ ہنستا ہے نہ روتا ہے

نہ بولو مجھ سے لیکن کیا مجھے دل سے بھلادوگے
کسی کی یاد مٹ جائے کہیں ایسا بھی ہوتا ہے

ستاروں سے لڑی رہتی ہے آصف کی نظر پیہم
یہ کس مہوش کی گردن کے لئے موتی پروتا ہے

(۱۵۷)

الفت میں جان و دل کا زیاں دیکھتے رہے
پھر بھی اسی میں راحت جاں دیکھتے رہے

غیر دل پہ التفات مغاں دیکھتے رہے
ہم اپنی بیکسی کا سماں دیکھتے رہے

لٹتا رہا یہ گلشن ایماں تمام عمر
ہم شیوۂ سکوت بتاں دیکھتے رہے

ناگاہ ان کا تیر نظر دل کے پار تھا
ہم بیخودی میں تاب کماں دیکھتے رہے

دنیائے دل کا رنگ ہی بدلا نہ آج تک
کیا کیا تغیرات جہاں دیکھتے رہے

رات ان کو بزم غیر میں کیا کیا سرور تھا
ہم بھی بضبط سوز نہاں دیکھتے رہے

شرط وفا یہ تھی کہ مٹاتے خود اپنا نام
واصف ہم ان کا نام و نشاں دیکھتے رہے

(۱۵۸)

سہل ہے مرنا مگر اے دوست مشکل ایک ہے
میرے جینے اور مر جانے کا حاصل ایک ہے

بازوِ نازک کو اب زحمت نہ دے لے تیغ زن
میرے دل کا لوٹنا اور رقص بسمل ایک ہے

ہم کو آزادی میں حاصل ہے اسیری کا مزہ
قید پاس وضع اور بند سلاسل ایک ہے

یوں تو محفل میں ہزاروں ہیں مقرب جاں نثار
دل اگر سچ پوچھتے ہو تم پہ مائل ایک ہے

کیا عنایت کیا اذیت کیا محبت کیا عناد
بحر غم میں موجۂ گرداب و ساحل ایک ہے

اُٹھ گئے کیا حضرت سائل کہ دلی لٹ گئی
ٹوٹ پڑنا چرخ کا اور مرگ سائل ایک ہے

سن کے واصف کی غزل کہنے لگے ارباب ذوق
آج محفل میں غزل سننے کے قابل ایک ہے

(۱۵۹)

کسی پہلو چین نہیں مجھے کہ الم سے سینہ فگار ہے
گئے جب سے روٹھ کے مجھ سے تم نہ سکوں ہے نہ قرار ہے

کسی مست عیش و نشاط کو کوئی کاش جا کے پیام دے
کہ یہاں بھی موج نسیم ہے گل و مل ہے ابر بہار ہے

نہ اٹھے گا تجھ سے یہ بارِ غم کہ یہ میرے دل کا ہی کام تھا
ترے غم نے پھونک دیا مگر وہی شان ضبط و قرار ہے

کبھی پست نہ کر سکے مجھے یہ جفائے دہر کے زلزلے
وہی آن ہے وہی عزم ہے وہی پاس عزو وقار ہے

دل و جان و عزت و آبرو رہِ امتحاں میں لٹا دیئے
یہ کہو کہ اور میں کیا کروں اگر اب بھی دل میں غبار ہے

گئی جس کی عزت و آبرو اسے زندگی کی خوشی ہو کیا
کہ ذلیل ہو کے اگر جیے تو زمیں کی پشت پہ بار ہے

جو کبھی گزر ہو سوئے عرب تو صبا یہ کہنا بصد ادب
کہ گناہگار تو ہے مگر یہ ترا ہی واصفؔ زار ہے

(۱۶۰)

جب میری محبت اسے معلوم ہوئی تھی
پلکوں میں بس اک لرزشِ موہوم ہوئی تھی

ساقی نے جو بھولے سے مرا نام لیا تھا
کس درجہ حریفوں میں مری دھوم ہوئی تھی

لکھی گئی اس سرخیٔ دل مضطر کے لہو سے
جب لوح پہ قسمت مری مرقوم ہوئی تھی

جب تجھ کو ازل میں دل بیدرد ملا تھا
اک آہ فسردہ مجھے مقسوم ہوئی تھی

کام آگیا دل رزمگہِ عشق و وفا میں
اف کیا ہی وہ اک لغزشِ معصوم ہوئی تھی

دلی کا جو یہ رنگ فلک نے ہے دکھایا
ایسی نہ کبھی دہلیٔ مرحوم ہوئی تھی

کیا خوب ہے واصفؔ ترا میخانے میں آنا
بن تیرے طبیعت مری مغموم ہوئی تھی

(۱۶۱)

کہاں فرصت کہ رفتارِ جہاں کچھ اور کہتی ہے
گلے مل لو کہ بانگِ کارواں کچھ اور کہتی ہے

مسلسل کلفتوں کے بعد کچھ خواہش ہے راحت کی
مگر بانگِ درائے کارواں کچھ اور کہتی ہے

غنیمت ہیں یہ لمحے اور کچھ ہنس بول لو یارو!
سکوتِ شب میں فطرت کی اذاں کچھ اور کہتی ہے

ترے غم کو سمجھ کر میہماں دل میں جگہ دی تھی
مگر اب تو نگاہِ میہماں کچھ اور کہتی ہے

سکونِ بحر سے اے ناخدا دھوکا نہ کھا جانا
سبک رفتاریٔ موجِ رواں کچھ اور کہتی ہے

مناسب ہے کہ صرف ان کو پکاریں شدتِ غم میں — ہماری عادتِ ضبطِ فغاں کچھ اور کہتی ہے

بڑے صبر و تحمل سے چھپایا تھا محبت کو
مگر واصفؔ نگاہِ دوستاں کچھ اور کہتی ہے

(۱۶۲)

ہم نے سمجھا تھا جنھیں دوست وہ دشمن نکلے — سیدھا سادہ جنھیں سمجھا تھا وہ پرفن نکلے

رازداں جن کو بنایا وہی غماز بنے — جن کو ٹھہرایا تھا رہبر وہی رہزن نکلے

جن کا ہر لفظ تھا اسرار و حکم کا حامل — انتہا نگاہ وفا میں وہی کودن نکلے

جن سے ہم صاف دلی سادہ مزاجی سے ملے — ان کے سینے حسد و کبر کے مخزن نکلے

میرا ہر شکوہ وہاں غیر مدلل ٹھیرا — ان کے الزام تھے جتنے وہ مبرہن نکلے

ان کا ہر قول و عمل لائقِ تعریف رہا — اک ہمیں تھے جو وہاں درخورِ کشتن نکلے

جن عزیزوں سے تھی احسان و کرم کی امید — میری جانب سے بچاتے ہوئے دامن نکلے

نفس کے پھندوں سے اب کون چھڑائے ہم کو — شیخ و واعظ تو گرفتارِ برہمن نکلے

چار تنکے بھی میسر نہ ہوئے گلشن میں
ہم جو واصفؔ پئے تعمیر نشیمن نکلے

(۱۶۳)

کیے لاکھوں ہی پھیرے ہم نے ہیم کوئے قاتل کے — مگر ارماں نہ نکلے آج تک اجڑے ہوئے دل کے

نہ پوچھ اے ہم نشیں لمحات رنگ ان کی محفل کے — کہ اب مجھ کو نہیں ہیں یاد اکثر حادثے دل کے

دیارِ عشق کی رسم کہن غیرت سے مرنا ہے — ہوئے ممنون کیوں اے اہلِ دل شمشیرِ قاتل کے

سفینہ اقتدار و حریت کا کچھ گراں نکلا — تنک آبی سے ڈوبے آکے ہم نزدیک ساحل کے

سفر آساں نہیں اے ہمدمو! راہِ محبت کا — کوئی پہنچا سرِ منزل تو پہنچا خاک میں مل کے

بجائے رنگ و بو شعلے بکھرے تھے غنچے غنچے میں — گلوں نے رازِ گلشن آشکارا کر دیا کھل کے

ستم ابذا ذلت تنگدستی خانہ بربادی
ہزاروں مختلف عنوان ہیں افسانۂ دل کے

بری تو ہو گئے محشر میں ہم لیکن تردد ہے
کہ جائیں خلد میں کیونکر بغیر اپنے مقابل کے

ہوئی مدت مگر دل سے وہ اک نقشہ نہیں مٹتا
دم رخصت بہائے تھے جو آنسو تم نے مل مل کے

رُلاؤ جس قدر چاہو ہمیں لیکن یہ آنسو
نہ ہو جائیں کہیں تخم بغاوت خاک میں مل کے

نہیں ملتے وہ جب تک صبر کر لیتا ہوں اے واصف
وہ کیسا وقت ہو گا جب جدا ہو جائیں گے مل کے

(۱۶۴)

آئے گی اور نہ اب تک آئی ہے
عمر ہم نے یونہیں گنوائی ہے

ان کے در تک کہاں رسائی ہے
ہاں فقط قسمت آزمائی ہے

کیوں بجھا جا رہا ہے دل میرا
آتش غم تری دہائی ہے

کیا ہو فتنہ بپا خدا جانے
آج اس نے نظر ملائی ہے

بات اپنی ہے دل میں جب تک ہے
مونھ سے نکلی تو پھر پرائی ہے

تم نے کیا کچھ کہا نہیں ہم کو
ہم جو بولیں تو بس لڑائی ہے

کوئی حامی نہیں فقیروں کا
آہ کیا شان کبریائی ہے

ان سے اب کوئی رسم و راہ نہیں
کیا کہوں کس کی بیوفائی ہے

نوش کی مستحق ہے مور حقیر
در خور نیش اپنا بھائی ہے

ہو گی رسی اب اور کتنی دراز؟
اور دو دن کی یہ خدائی ہے

اے خوشا داستان خیرانجام
زندگی جان دے کے پائی ہے

خاک و خوں سے ہے آبروئے یار و؛
یوں ہی اوپر سے ہوتی آئی ہے

اُف غم عشق کی توانائی
کیا کٹھن زور آزمائی ہے

آؤ دیکھو تباہیاں دل کی
کیا قیامت غموں نے ڈھائی ہے

ہم نے مانا کہ دل نہیں ملتا بات کرنے میں کیا برائی ہے
پھر یہ موقع کبھی ملے نہ ملے گفتگو ہم نے خود بڑھائی ہے

بدگماں کیوں ہوئے ہو آصف سے
دشمنوں نے یونہیں اڑائی ہے

(۱۶۵)

عجیب روگ ہمیں عشق نے لگایا ہے کہ پہروں روئے ہیں جب کوئی یاد آیا ہے
ترے فراق نے برسوں ہمیں رلایا ہے گئے ہیں جی تو اب ہم کو صبر آیا ہے
حریم دل میں چراغاں ہے آرزوؤں کا تمہارے واسطے ہم نے یہ گھر سجایا ہے
ہمارے بخت کی ظلمت میں کچھ کمی نہ ہوئی اگرچہ دل کا دیا مدتوں جلایا ہے
نہ شعلہ ہے نہ دھواں ہے نہ آنکھ میں آنسو کچھ ایسا تیرے تغافل نے جی جلایا ہے
خدا کے واسطے کچھ تو ہی کر مدد اے یاس کہ آس نے تو ہمیں رات بھر جگایا ہے
نہیں ہے ہم پہ عنایت تری مگر اے دوست ہمیشہ نام ترا سن کے سر جھکایا ہے
قفس سے چھوٹ کے بیشک خوشی ہوئی تھی ہمیں اسی خوشی نے ہمیں آج تک رلایا ہے
ہماری ساری تمنائیں رہ گئیں گھٹ کر تمام عمر جنھیں خون دل پلایا ہے
گناہگار تو ہیں ہم مگر تمہارا نام کتاب حق میں غفورٌ رحیم آیا ہے
بایں مذلت و خواری کبھی تمہارے سوا کسی کے در پہ جبین کو نہیں جھکایا ہے
بہ ابتلائے مسلسل یہ ناتواں بندے اور اس پہ طعنۂ اعدا نے دل دکھایا ہے
کہاں وہ رفعت گردوں کہاں یہ پستئ خاک فلک نے آہ کہاں سے کہاں گرایا ہے
ستم کی ناؤ ابھی بھر نہیں چکی شاید یہاں کلیجہ غریبوں کا منھ کو آیا ہے

نہ علم و فضل ہے آصف نہ عظمت کردار
بڑوں کی موت نے مجھ کو بڑا بنایا ہے

(۱۶۶)

کسک دل کی نہیں جاتی اذیت کم نہیں ہوتی
یہ ایسا ابتلا ہے جس کی مدت کم نہیں ہوتی

کسی صورت سے غم کھانے کی عادت کم نہیں ہوتی
مسرت میں بھی دل سے غم کی لذت کم نہیں ہوتی

ادھر چاہت ہی چاہت ہے یہ چاہت کم نہیں ہوتی
ادھر نفرت ہی نفرت ہے یہ نفرت کم نہیں ہوتی

ہزاروں بار ہم تو خوب توبہ کر چکے لیکن
محبت پھر محبت ہے محبت کم نہیں ہوتی

چراغ آرزو سینے میں اک مدت سے روشن ہے
مگر تاریکی شبہائے فرقت کم نہیں ہوتی

بھڑاس اس شوخ کے دل کی نکل جائے تو اچھا ہے
کسی کی گالیوں سے اپنی عزت کم نہیں ہوتی

خدا شاہد ہے اب تو گوشۂ خلوت ہے اور میں ہوں
مگر اپنے پرائے کی ملامت کم نہیں ہوتی

وفا کے شوق میں ایماں سے بھی ہم ہاتھ دھو بیٹھے
مگر اس فتنہ پرور کی رعونت کم نہیں ہوتی

پلادے آج تو جتنی میسر ہو سکے ساقی!
یہ ایسی تشنگی ہے جس کی شدت کم نہیں ہوتی

نظر کے سامنے دشت جنوں یا صحن گلشن ہو
کسی صورت سے دیوانوں کی وحشت کم نہیں ہوتی

نہ ہو مایوس اے واصف اگر تو دل شکستہ ہے
شکستہ ہو کے اس شیشے کی قیمت کم نہیں ہوتی

(۱۶۷)

جفا جو سے محبت آفریں سے
محبت ہے مجھے اک نازنیں سے

کوئی کہہ دو محبت کے امیں سے
نہ نکلے آہ بھی قلب حزیں سے

فلک کیا جانے قیمت عاشقوں کی
ہمارا مرتبہ پوچھو زمیں سے

الٰہی خیر ہو جذبات دل کی
بھڑک اٹھیں نہ آہ آتشیں سے

اڑا جاتا ہے دل بھی روح کے ساتھ
تری آواز آتی ہے کہیں سے

یہ ناموس وفا ہے آہ کیونکر
اٹھاؤں اشک خونیں کو زمیں سے

یہ کہتی ہے تڑپ واصف کے دل کی
ملے گا کھوج منزل کا یہیں سے

(۱۶۸)

دل پہلے پہل مجھ سے لگایا ہے کسی نے
یوں زیست کا اک راز بتایا ہے کسی نے

گیت اپنی محبت کا سنایا ہے کسی نے
نغمات کی لہروں میں بہایا ہے کسی نے

پردہ رخِ تاباں سے ہٹایا ہے کسی نے
سوئے ہوئے فتنوں کو جگایا ہے کسی نے

مخمور نگاہیں ہیں قیامت کی نگاہیں
جذبات کا طوفان اٹھایا ہے کسی نے

مجبور فنا خرمنِ تمکین و خرد ہے
بجلی کی طرح اشک گرایا ہے کسی نے

الفت کی ہے اک طنز میں تاریخ مکمل
پیمان وفا یاد دلایا ہے کسی نے

واصف وہ مجھے یاد ہے اندازِ تغافل
نادوں میں اثر دے کے رلایا ہے کسی نے

(۱۶۹)

یہ خونِ تمنا کہ تو مستور ہے مجھ سے
یہ جبر محبت کہ تو رنجور ہے مجھ سے

پڑتی ہے رقیبوں پہ باندازِ توجہ
وہ اک نگہ ناز کہ معذور ہے مجھ سے

کانوں میں مرے تیری صدا گونج رہی ہے
نزدیک ہے تو دل سے مگر دور ہے مجھ سے

ہے جورِ فلک عشق کی فطرت کا تقاضا
یہ گردشِ ایام بھی مجبور ہے مجھ سے

زندہ رہوں اور جھیلوں جدائی کی اذیت
یہ حوصلہ اس کو ابھی منظور ہے مجھ سے

سینہ ہے تبسم سے ترے مطلع انوار
تو پھر بھی مری جان بہت دور ہے مجھ سے

ہر لمحہ سمجھتا ہوں کہ سرحد پہ قدم ہے
اور منزلِ مقصود ابھی دور ہے مجھ سے

یہ کارگہ دہر کہ ہے مجمع اضداد
ہے اس میں مسرت بھی مگر دور ہے مجھ سے

واصف نہیں آسان محبت کا چھپانا
قائم کوئی دن اور یہ دستور ہے مجھ سے

(۱۷۰)

ہے دیدنی کشاکشِ پنہانِ زندگی — امکانِ مرگ ہے کبھی سامانِ زندگی
یہ سادگیٔ عشق ہے یا ہے فریبِ نفس — مر کر بھی کر رہا ہوں میں اعلانِ زندگی
بے تاب کوئی راز ہے اظہار کے لئے — بدلا ہوا سا آج ہے عنوانِ زندگی
اب تو قدم اٹھانے کی طاقت نہیں رہی — طے ہوگا کس طرح یہ بیابانِ زندگی
بارانِ اشک نے اسے واصف مٹا دیا
لکھا تھا خونِ دل سے جو عنوانِ زندگی

(۱۷۱)

نسیمِ صبح یوں لے کر ترا پیغام آتی ہے — پری جیسے کوئی ہاتھوں میں لے کر جام آتی ہے
وہ منظر بھی کبھی دیکھا ہے اہلِ کارواں تم نے — امنڈ کر جب کسی بچھڑے ہوئے پر شام آتی ہے
یہاں اب ناتوانی سے قدم بھی اٹھ نہیں سکتے — اُدھر محفل سے ساقی کی صلائے عام آتی ہے
کسی کا خونِ دل کھنچ کر ٹپک جاتا ہے آنکھوں سے — کسی کی آنکھ میں کھنچ کر مئے گلفام آتی ہے
یہی آہ رسا میری کہ جس پہ ناز تھا مجھ کو — پہنچ جاتی ہے گردوں تک مگر ناکام آتی ہے
ادھر آ اور اٹھا کر جام کو گردش میں لا ساقی — غضب ہے اب مرے سو تھ گردشِ ایام آتی ہے
مقدر کا ستارہ گر نہو رخشندہ اے واصف
نہ ہمت ساتھ دیتی ہے نہ حکمت کام آتی ہے

(۱۷۲)

کارواں آنکھوں سے اوجھل اور محمل دور ہے — ہاں قدم آگے بڑھا اے دل کہ منزل دور ہے
بے خبر زندانِ مسجد کی یہ کافی ہے تجھے — محتسب آگے نہ جا رندوں کی محفل دور ہے

اب شہادت اے خدا کیونکر مجھے ہوگی نصیب
پائے رفتن ہے شکستہ بزم قاتل دور ہے

کیا ہی درد انگیز ہے یہ منظر امید و بیم
بے ہنر ہیں اہل کشتی اور ساحل دور ہے

سائل شیریں سخن کی پیروی کرتے ہو تم
لیکن اے واصف مقام فضل سائل دور ہے

(۱۷۳)

رہی کچھ ایسی معزز کہ ہاتھوں ہات گئی
کہاں سے چل کے کہاں تک ہماری بات گئی

دم وداع ذرا صبر تو کیا ہوتا
ذرا سی آہ میں اے دل ہماری بات گئی

چمن میں آکے ہمیں کس نے کر دیا رسوا
اڑائی ایسی ہوا ئی کہ پات پات گئی

فسانۂ غم ہجراں تمام ہو نہ سکا
تلاش لفظ و عبارت میں ساری رات گئی

کریں گے اب تو زمانے کی ناز برداری
وہ بات جس پہ ہمیں ناز تھا وہ بات گئی

متاع تھی مری جو کچھ وہ اک یہی دل تھا
گیا جو دل تو مری ساری کائنات گئی

تمام عمر وہ نا آشنا رہے واصف
ہماری جان بھی بیگانہ حیات گئی

(۱۷۴)

پیام شوق وہاں میرا باریاب تو ہے
جواب خط نہیں آیا مگر جواب تو ہے

یہ مانتا ہوں تحمل میں کچھ ثواب تو ہے
مگر یہ صبر مسلسل بھی اک عذاب تو ہے

دعائے نیم شبی میری مستجاب تو ہے
مزاج حسن میں کچھ آج انقلاب تو ہے

زہے نصیب اگر یوں وہ دل نواز رہے
جواب تلخ بھی لذت خطاب تو ہے

خبر ہوئی انھیں اپنے شباب کی شاید
کچھ آج کل انھیں واصف سے اجتناب تو ہے

(۱۷۵)

نزدیک سا ہوا ہے کچھ دور سا ہوا ہے
کیونکر کہوں کہ وہ بت مغرور سا ہوا ہے

یا وہ نوازشیں تھیں یا یہ ہے بے رخی اب
یہ خوگر عنایت مقہور سا ہوا ہے

یہ ہمدموں کی نظریں یہ چشمکیں اشارے
راز نہاں ہمارا مشہور سا ہوا ہے

دم بھر میں طے کیے تھے جس نے یہ کوہ و صحرا
وہ اشہب عزیمت رنجور سا ہوا ہے

کل میری بات سن کر اس نے نظر جھکا لی
ہمدم! سوال میرا منظور سا ہوا ہے

تابانیوں سے جس کی عالم ہوا منور
اب وہ چراغ جادہ بے نور سا ہوا ہے

اے دوستو! مرا دل بھولا نہیں ہے تم کو
عشق بتاں کے ہاتھوں مجبور سا ہوا ہے

دیکھو تو اس کا دل ہے کتنا ستم رسیدہ
محفل میں جو بظاہر مسرور سا ہوا ہے

تھی جس کے دم سے رونق رسوائے خلق واصف
جور فلک کے ہاتھوں معذور سا ہوا ہے

(۱۷۶)

عداوت سہتے سہتے دل میں نفرت آہی جاتی ہے
زباں پر شدت غم میں شکایت آہی جاتی ہے

سوال وصل پر اپنی تو شامت آہی جاتی ہے
فضیحت ہو ہی جاتی ہے قیامت آہی جاتی ہے

خدا جب مال دیتا ہے رعونت آہی جاتی ہے
حکومت ہاتھ آتی ہے تو نخوت آہی جاتی ہے

مرا دل کس قدر دکھا ہوا ہے کہہ نہیں سکتا
گلے ملتی ہیں جب نظریں محبت آہی جاتی ہے

ابھی دیکھا نہیں ہے تو نے اس کا جلوہ اے ناصح
کہوں کیا اچھی صورت پر طبیعت آہی جاتی ہے

کہاں تک بیگناہی اپنی ہم ان کو جتائیں گے
کہ سنتے سنتے پھر دل میں کدورت آہی جاتی ہے

زبان شیخ حق گوئی میں ہے تیغ دو دم لیکن
حضور اہل ثروت اس میں لکنت آہی جاتی ہے

خلوص اہل دل ہے رائگاں ناحق شناسوں میں
یہاں صدق و صفا خطرے میں عزت آہی جاتی ہے

جناب شیخ کے غصے کی واصف تم نہ کر پروا
اگر ہو تربیت ناقص جہالت آ ہی جاتی ہے

(۱۷۷)

ہو میرا شہیدوں میں اگر نام بہت ہے مجھ کو تو بس اک جلوہ سرِ بام بہت ہے
ہے ایک دم سرد کہانی مرے دل کی قاصد مری جانب سے یہ پیغام بہت ہے
ماضی کے تصور سے کہو پاس نہ آئے تنہا مجھے رہنے دے ابھی کام بہت ہے
بندہ کہو دیوانہ کہو کچھ تو کہو تم اتنا ہی مرے واسطے انعام بہت ہے
ہم راضی ہیں لیکن تری شہرت پہ نہ حرف آئے سنتے ہیں ترا لطف و کرم عام بہت ہے
تم جس کو نوازو وہ برا ہو نہیں سکتا مجھ پر تو بس اک زیست کا الزام بہت ہے
اے کاش ٹھٹک جائے ذرا ناقۂ لیلیٰ دیوانے کو بس وقفۂ یک گام بہت ہے
دنیا کی روش موجبِ افسوس ہے لیکن دامن کشئ خلق میں آرام بہت ہے
کل آنے کا وعدہ ہے زہے خوبئ قسمت لیکن تری اس کل میں تو ابہام بہت ہے
اب گورِ غریباں پہ چراغاں نہ کریں آپ جگنو کی تجلی ہی سرِ شام بہت ہے
اچھا ہے نہ پہنچے جو انھیں میری کوئی بات
واصف کو وہ کہتے ہیں کہ گمنام بہت ہے

(۱۷۸)

تضمین بر غزل خواجہ میر دردؔ

خیر و شر کی کشمکش میں مر چلے حسرتوں سے اپنا دامن بھر چلے
بارِ عصیاں دوش پر لے کر چلے تہمت چند اپنے ذمے دھر چلے
جس لیے آئے تھے ہم سو کر چلے

آرزوؤں کا محل ویران ہے مضطرب دل مچلے میں جان ہے

زندگی کی کیا یہی پہچان ہے — زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

اس چمن میں کس کو دائم ہے بقا — دو گھڑی کی زیبست ہے آخر فنا
جتنے چاہے آکے تو غنچے کھلا — کیا ہمیں کام ان گلوں سے اے صبا
ایک دم آئے ادھر ادھر چلے

جان ہر دم مبتلائے پیش و پس — چین دل نے کبھی نہ پایا یک نفس
تاک میں بیٹھا ہے اب تک بوالہوس — دوستو! دیکھا تماشا یاں کا بس
تم رہو اب ہم تو اپنے گھر چلے

پرنم اس کی آنکھ کو کب جانیے — ہر فغاں کو رائگاں اب جانیے
کچھ اثر اس پر بھی ہو جب جانیے — آہ بس مت جی جلا تب جانیے
جب کوئی افسوں ترا اس پر چلے

وقف گردش ہوں ویسا ہی دوست — ہیں تحمل کیش ہوں ویسا ہی دوست
اک جریح نیش ہوں ویسا ہی دوست — ایک میں دل ریش ہوں ویسا ہی دوست
زخم کتنوں کے سنا ہے بھر چلے

ہم نے جب رکھا قدم اس بزم میں — ہر طرف تھا غم ہی غم اس بزم میں
لٹ گیا اپنا بھرم اس بزم میں — شمع کی مانند ہم اس بزم میں
چشم تر آئے تھے دامن تر چلے

مدتوں بیکار اتنے دکھ بھرے — جستجو کی کلفتوں میں کیوں مرے
وہ تو حاضر ہے رگ جاں سے ورے — ڈھونڈتے ہیں آپ سے اس کو پرے
شیخ صاحب چھوڑ گھر باہر چلے

کیا کہیں کیا گزری ہم پر آپ سے — دل تو چل نکلا ہے اکثر آپ سے

خود چلے پھر آئے کھنچ کر آپ سے　　ہم نہ جانے پائے باہر آپ سے

وہ ہی آڑے آگیا جیدھر چلے

کس قدر ناز و نعم میں ہم پلے　　داغ تھا دل میں نہ کوئی ولولے

تھے غم الفت سے فارغ حوصلے　　ہم جہاں میں آئے تھے تنہا دلے

ساتھ اپنے اب اسے لے کر چلے

اک ظہور جلوہ تھا مقصودیاں　　یک بیک لاکر کیا موجودیاں

کیا ہے اپنی فطرت بیسودیاں　　جوں شرر ہے ہستی بے بودیاں

بارے ہم بھی اپنی باری بھر چلے

ایک دن ہونا ہے آخر چھٹ چھٹاؤ　　دو گھڑی کا بس غنیمت ہے بناؤ

حق بنا رکھے یہ نیرا رکھ رکھاؤ　　ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ

جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

اک تماشا تھا یہ سب عیش و طرب　　مختصر تھے کس قدر لمحات شب

کیا کہے واصف کہ ہے جائے ادب　　درد کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب

کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

نظمیں اور قطعات و رباعیات

مناجات

بڑی پر درد ہے میری کہانی — اکارت ہی رہی یہ زندگانی
ہمیشہ رنج دنیا کا اٹھایا — خیالِ آخرت اب تک نہ آیا
مری نادانیوں کا کیا ٹھکانا — کہ گھاٹے کو کبھی گھاٹا نہ جانا
جوانی خوابِ غفلت میں گنوائی — بجز عصیاں نہ کی کوئی کمائی
تباہی کی طرف جاتا رہا میں — فریبِ زندگی کھاتا رہا میں
ہمیشہ میں نے ہی تجھ کو بھلایا — نہ بھولا تو مگر مجھ کو خدایا!
مسلسل میں نے ہی منہ تجھ سے موڑا — مگر تو نے کبھی مجھ کو نہ چھوڑا
جہاں بھی بھاگ کر جاتا رہا میں — تجھے نزدیک تر پاتا رہا میں
نہ سمجھا میں کبھی تیرا اشارا — مجھے ہر موڑ پر تو نے پکارا
تری جو دی ہوئی تاب و تواں ہے — وہ شغلِ معصیت میں رائگاں ہے
مگر کب تک یہ تابِ زندگی ہے — کہ آخر عاجزی ہی عاجزی ہے
مرا کیا منہ کہ تجھ سے کچھ کہوں میں — نہیں ممکن کہ بالکل چپ رہوں میں
فقط اتنی ہی میری التجا ہے — مرے دل میں بس اک یہ مدعا ہے
کہ مدھم جب چراغِ زندگی ہو — ہجومِ ظلمت و بیچارگی ہو
اجل جب ہر طرف سے مجھ کو گھیرے — نظر اس وقت تو مجھ سے نہ پھیرے
اگر رسمِ وفا کو تو نے توڑا — اور ایسے وقت میرا ساتھ چھوڑا
تو آصف کا کہاں ہوگا ٹھکانہ — کہ تجھ سا کون ہے یکتا یگانہ
سزا دیدے تو یہ بندہ ہے تیرا — ترس کھائے تو یہ شیوہ ہے تیرا

پشیمانی سے میری آنکھ نم ہے
اگر تو بخش دے تیرا کرم ہے

نعت

قلم جب سر جھکا کر لوحِ دل کا ترجماں ہوگا محمدؐ کی ثنا میں جب قلم رطب اللساں ہوگا
صریرِ خامہ رشکِ نغمۂ لاہوتیاں ہوگا

محمدؐ رحمتِ عالم حبیبِ خالقِ اکبر محمدؐ مہبطِ وحیِ الٰہی شافعِ محشر
سراپا ناز بن کر جو شفیعِ عاصیاں ہوگا

وہ جس کی جنبشِ ابرو سے قوموں پر شباب آیا وہ جس کے اک تبسم سے جہاں میں انقلاب آیا
زمانہ بھی قدم لے گا وہ جس پر مہرباں ہوگا

جزاک اللہ وہ امت کے غم میں ناشکیبائی تعالیٰ اللہ وہ محشر میں تیری شان یکتائی
ترا ہی دامنِ رحمت پناہِ بیکساں ہوگا

حریمِ راز کے ہر مرحلے سے آگہی تیری وہ محبوبیتِ کبریٰ وہ شانِ عاشقی تیری
ادب گاہِ قدس میں کون تجھ سا نکتہ داں ہوگا

بہت ہی ناتواں اے رحمتِ عالم یہ امت ہے تری نسبت کے ہم لائق نہیں پر تجھ سے نسبت ہے
بایں بیچارگی کب تک ہمارا امتحاں ہوگا

ہماری غیرتوں کا خون ہوگا رائیگاں کب تک روایاتِ کہن کی ہوں گی یہ رسوائیاں کب تک
ہمارا حال کب تک عبرتِ اہلِ جہاں ہوگا

اگر واصف کا دل سوزِ غمِ ہجراں سے گھبرائے اگر واصف فلک کی شورشوں سے تنگ آجائے
تو اس کا مرکزِ امید کس کا آستاں ہوگا

بہ بارگاہ رسالت

ترے فیضِ توجہ سے تخیل کامراں میرا حریمِ دل میں ہے تیرا تصور میہماں میرا
فضائے خلد سے موجِ ہوائے مشکبار آئی ترے ہی لطف سے اجڑے بیاباں میں بہار آئی
الوہیت کے تو جلووں سے ہو کر فیضیاب آیا ترے عزمِ نظر سے رقص کرتا آفتاب آیا

وہ بزم خاص میں تیری دل آرائی و رعنائی — وہ بارعب تھی میداں میں تیری لشکر آرائی
غریبوں اور کمزوروں پہ الفت گستری تیری — باں معصومیت صرف عبادت زندگی تیری
اگر تو جلوہ آرا ہو، قمر روپوش ہو جائے — نظر جب تیز ہو تیری فلک مدہوش ہو جائے
دل مظلوم کو تجھ سے امید لطف و رحمت ہے — بڑی مدت سے جان مضطرب مجبور فرقت ہے
رہے گی منزل مقصود آنکھوں سے نہاں کب تک — بھٹکتا ہی رہے گا آہ! تیرا کارواں کب تک

اگر واصف پہ تیری اک نگاہ ناز ہو جائے
تو واصف روح ہستی بن کے خود اک راز ہو جائے

قصیدہ نعتیہ

سجاؤ بزم کو اے ہمدمو! مینا و ساغر سے — گھٹائیں مست ہو کر آ رہی ہیں جام کوثر سے
خرابات جہاں پر بن کے باران کرم برسے — وہ کچھ قطرے جو چھلکے تھے مرے ساقی کے ساغر سے
سواد کوئے جاناں سے ہوائے مشکبار آئی — مشام جاں معطر ہو گیا زلف معنبر سے
یہ جرأت ہے کہ دم بھرتا ہوں میں محبوب داور کا — سزا پاؤں گا شاید رحمت دارائے محشر سے
بغیر آب ندامت صورت تطہیر نا ممکن — کہاں تک دھوؤں میں اپنی زباں کو مشک و عنبر سے
خدا کا نام لے کر اب کسی کا نام لیتا ہوں — بہت مجبور ہوں میں اضطراب قلب مضطر سے
محمدؐ سرور اولاد آدم رحمت عالم — مراحل جس کے برتر موقف ناموس اکبر سے
کمال صنع خالق مطلع انوار ربانی — خلیل اللہ کا چمکا چاند عبداللہ کے گھر سے
حصیر و خاک پر دل کس قدر تھا مطمئن تیرا — تعالی اللہ جنت کو ہے کیا نسبت ترے گھر سے
نظر نیچی نہ ہو جائے کہیں اغیار کے آگے — تہی دامن تو میں ہرگز نہ جاؤں گا ترے در سے
کہاں واصف کہاں تیری ثنا اے صاحب اسریٰ — ہنر شاہیں کا ظاہر ہو نہیں سکتا کبوتر سے
سعادت مطلع نو کی ہوئی حاصل تخیل کو — زبان خامہ لذت یاب ہے قند مکرر سے
ملی ہے آج کیسی نعمت عظمیٰ مقدر سے — مشرف ہے مرا ذوق سخن نعت پیمبر سے

صلوٰۃ اے شافع محشر سلام اے ساقی کوثر
سلام آتے ہیں تجھ پر بارگاہ رب اکبر سے

ترے سوز محبت نے غلاموں کو کیا آقا
کہ ذرے اوج پاتے ہیں نگاہ شاہ خاور سے

ہنرگاہ قدس کا نقش آخر ہے تری صورت
تری آنکھیں منور جلوۂ خلاق اکبر سے

ستاروں کی طرح چمکے دلیل کارواں ہو کر
وہ کچھ ذرے جو مس ہو کر اڑے تھے پائے اطہر سے

چہار ارکاں کی صورت ملت بیضا کا شیرازہ
منظم ہے ابوبکر و عمر عثمان و حیدر سے

مدد کو جب گنہ گاروں کی وہ تشریف لائیں گے
تو ہوگا خیر مقدم کلمۂ اللہ اکبر سے

مرا نغمہ قبول خاطر والا ہوا شاید
کہ مجھ پر پھول برسائے گئے محراب و منبر سے

خدا جانے کہاں اور کون اڑا کر لے گیا اس کو
کسی کی یاد میں آنسو جو ٹپکا دیدۂ تر سے

نہ حسرت جاہ و عزت کی نہ پروا مال و دولت کی
ملا ہے مجھ کو وہ صدقہ رسول اللہ کے در سے

نہ دیکھو ان کو تم ٹیڑھی نظر سے اے جہاں والو
نظر آتے جو ہیں یہ حضرت وآصف قلندر سے

ستاروں کی طرح دل کے شرارے جگمگاتے ہیں
یہ ٹکڑے دل کے ہیں یا ماہ پارے جگمگاتے ہیں

طلوع جام مے کا وقت ہے مینا اٹھا ساقی
گھٹا آئی ہے فطرت کے اشارے جگمگاتے ہیں

کسی کا نام آتے ہی مہک اٹھتے ہیں صحرا بھی
بہاریں مسکراتی ہیں نظارے جگمگاتے ہیں

ہوئے ہیں ان کے پائے ناز سے پامال یہ ذرے
فلک سے یا اتر کر چاند تارے جگمگاتے ہیں

در محبوب سے ہم کو ملا لکھا غلامی کا
نوشتے لوح قدرت پر ہمارے جگمگاتے ہیں

توجہ سے تری ہم بے سہاروں کا وہ رتبہ ہے
نظر کے سامنے آکر سہارے جگمگاتے ہیں

اگر ظلمت کی موجیں گھیر لیتی ہیں سفینے کو
یکایک بحر عصیاں کے کنارے جگمگاتے ہیں

دم فرقت جو آنسو دیدۂ جبریل سے چھلکے
عرق بن کر وہ عارض پر تمہارے جگمگاتے ہیں

کرن پھوٹی ہے یا پرتو ہے ان کے رخ انور کا
شب ہجراں میں کیوں اشکوں کے دھارے جگمگاتے ہیں

نجوم جلوہ ہے اطراف دل پہ اس طرح واصف
ہلال عید کے جیسے کنارے جگمگاتے ہیں

بالاتر از قیاس ہے عظمت رسول کی
تفسیر اسم ذات ہے بعثت رسول کی

سرچشمۂ حیات سیاست رسول کی
دستور کائنات ہدایت رسول کی

خیر الامم ہے اس لئے امت رسول کی
ہے مظہر کمال رسالت رسول کی

لاتایئسوا کی شان ہے خلق عظیم میں
لاتقنطوا کی شرح شفاعت رسول کی

بہوت آج تک ہیں فصاحت کے مدعی
عالم پہ چھا گئی ہے فصاحت رسول کی

دل ان کے پاکباز تھے روحیں تھیں خوش نصیب
جن کو ہوئی نصیب رفاقت رسول کی

دنیا ہی اس کے دل کی یکایک بدل گئی
جس پر پڑی ہے چشم عنایت رسول کی

نامعتبر ہے دعویٰ توحید دوستو!
تسلیم اگر نہیں ہے وضاحت رسول کی

راہ طلب میں خوب خرد کے دیئے جلاؤ
لیکن ہر قدم ہے ضرورت رسول کی

مانا کہ تجھ کو پیار ہے اپنے رسول سے
یارب ذلیل کیوں ہے یہ امت رسول کی

سینے سے میرے دل کو فرشتو! نکال لو
کیونکر سوئے قبر میں جائے گی الفت رسول کی

مجرم ہوں میرا نامۂ اعمال ہے سیاہ
حاصل تو ہے مگر مجھے نسبت رسول کی

واصف اگر نہیں ہے تمہیں تاب انتظار
خود کو مٹا کے دیکھ لو صورت رسول کی

ملی و قومی نظمیں

یادِ ماضی

۱۹۲۸ء

مسلمِ خستہ کی بربادی کا چرچا دیکھ کر — مضطرب ہوتا ہوں یہ عالم کا نقشہ دیکھ کر
اے بنائے قوم و ملت پیکرِ رعب و جلال — درد سا اٹھتا ہے دل میں تجھ کو رسوا دیکھ کر
عظمتِ دیرینہ تیری قصۂ پارینہ ہے — یاد آ جاتے ہیں وہ دن قصرِ حمرا دیکھ کر
رہروِ راہِ حقیقت تجھ کو یہ کیا ہو گیا — اب قدم رکھتا نہیں کیوں پست و بالا دیکھ کر
تو ہی تھا سطوت و شوکت کا تھا سرمایہ دار — سر جھکا دیتے تھے اپنا تجھ کو اعدا دیکھ کر
نغمۂ وحدت سے تیرے گونجتے تھے آسماں — دنگ رہ جاتی تھی دنیا تیرا تقویٰ دیکھ کر
تیرے نعروں سے دہل جاتے تھے دل کفار کے — سرنگوں ہوتے تھے تجھ کو کار فرما دیکھ کر
اب یہ کیوں افسردگی سی عزمِ مردانہ میں ہے — اب جھجک جاتا ہے کیوں باطل کی دنیا دیکھ کر
تیرے دل میں موجزن دریائے جذبِ حق نہیں — آہ! کیوں دھوکے میں ہے تو ریگِ صحرا دیکھ کر
دیکھ تو چشمِ حقیقت بیں سے دیوانہ نہ بن — کیوں ہوا جاتا ہے بیخود رنگِ مینا دیکھ کر
اپنی افسردہ دلی غیروں کی سرگرمی بھی دیکھ — عہدِ ماضی یاد کر باطل کا فردا دیکھ کر
تو وہی ہے جس کا سینہ مرکزِ اخلاق تھا — خود کھنچے آتے تھے تجھ کو اہلِ دنیا دیکھ کر
تیری ہستی نے دیا عالم کو پیغامِ بہار — پھول بن جاتا تھا تجھ کو خارِ صحرا دیکھ کر
جادۂ صدق و صفا سے منحرف کیوں ہو گیا — رکھ قدم منزل میں تو آئینِ آبا دیکھ کر

شوکتِ دیرینۂ آصف یاد آتی ہے مجھے
دل تڑپ جاتا ہے مسجد کو کلیسا دیکھ کر

دہلی مرحوم

۱۹۲۹ء

اے جہاں آباد اے معمورۂ علم و حکم — اے بہارستانِ ہند اے مرجعِ روم و عجم
خوابگاہِ راحتِ شاہانِ اسکندر حشم — پردہ گاہِ حسنِ فطرت غیرتِ باغِ ارم
آہ! کیا دن تھے کہ تو علم و ادب کا مہد تھا
عافیت خوشحالی و عیش و طرب کا عہد تھا

یادگارِ سطوتِ غرناطہ و بابل ہے تو — بحرِ تہذیب و تمدن کے لئے ساحل ہے تو
دل اگر ہندوستاں ہے تو سوادِ دل ہے تو — بعرِ پرنور جہاں پر ایک زیبا تل ہے تو
تیری ہستی رازدارِ عظمتِ دیرینہ ہے
ہر ادا سے تیری ظاہر شوکتِ دیرینہ ہے

حیف اے منزل گہِ صولت نشانِ رفتگاں — تھا کبھی فخرِ جہاں اے بوستانِ رفتگاں
تیرے ذروں میں نہاں ہے عز و شانِ رفتگاں — تجھ میں خوابیدہ غبارِ کاروانِ رفتگاں
تھا تو ہی شمعِ تمدن بزمِ فطرت کے لئے
تیری ہستی مایۂ نازش تھی ملت کے لئے

تھا علاء الدین خلجی کا جلالت گاہ تو — بابر و صاحبقراں کا تھا مہابت گاہ تو
دو دمانِ مغلیہ کا تھا وجاہت گاہ تو — آہ! لیکن آج ہے ان سب کی تربت گاہ تو
تو ہی جولانگاہ شاہنشاہ عالمگیر تھا
خوابِ رفعتہائے یوناں کی تو ہی تعبیر تھا

تجھ میں اکبر سے کے آیا تھا جلالِ خسروی — مظہرِ فر شہاب الدین اعظم تھا تو ہی

اے دمشق ہند اب وہ تیری دولت کیا ہوئی — کیوں مئے عرفاں کے مستوں سے ہے میخانہ تہی
عدل سے اخلاق سے آباد تھی محفل تری
جلوہ گاہ عظمت بغداد تھی محفل تری

مرجع اہل کمال و مخزن شعر و سخن — سیر گاہ اہل دل زہد و سماحت کا چمن
مرکز خلق و مروت اور شجاعت کا وطن — کشت زار آرزو ہائے سلاطین کہن
تیرے فاتح کیا ہوئے وہ تیرے والی ہیں کہاں
جن سے تو گلشن بنا تھا اب وہ مالی ہیں کہاں

اے جہان آباد اے گہوارۂ دین متیں — تھا کبھی تو مہبط انوار رب العالمیں
بارگاہ خاص تھی ہمدوش فردوس بریں — تھی زمانے کی عقیدت گاہ تیری سرزمیں
ہے تو ہی ماوی و مرکز حادثات دہر کا
ساحل خوددار ہے تو آفتوں کی لہر کا

عبرت افزا اور حسرت زا ہیں ویرانے ترے — نوحہ گر ہیں تیری بربادی پہ کاشانے ترے
آج ساقی ہے گل و مل ہے نہ میخانے ترے — تو ہی فرما کس طرف جائیں یہ دیوانے ترے
تیری تاریخ کہن پہروں رلاتی ہے ہمیں
پھر وہی جمعیت دل یاد آتی ہے ہمیں

اب نگاہیں ڈھونڈھتی ہیں تیری بزم ناز کو — کان اب سنتے نہیں تیری نوائے راز کو
دل ترستا ہے ترے ہنگاموں کی آواز کو — کون سے پردے میں ڈھونڈھوں میں ترے اس ساز کو
بزمگاہ بیکسی ہے پر سکوں منظر ترا
خون ارماں سے لبالب شیشہ و ساغر ترا

کیا ہوا جو جنبش لب پہ ترا اعجاز تھا — حکمت و ارشاد جس پر قدسیوں کو ناز تھا
خاک میں ملنے پہ بھی باقی ہے جو اعزاز تھا — تیری بربادی کا یہ بھی اک نیا انداز تھا

آج تک ہے نام تیرا الذت کام و دہاں
آستاں تیرا ہے اب تک روکش ہفت آسماں

پھر سے گر جائے جہاں پر تیری عزت کا علم
کاش دیرینہ تری عظمت ہو تو ہو اور ہم
شان پہلی سی ہو تجھ میں پھر بنے رشکِ ارم
دیکھ لیں آنکھوں سے اپنی ہم ترا جاہ و حشم

سامنے آنکھوں کے آجائیں وہ پہلی شوکتیں
دیکھ لے پھر سے جہاں تیری پرانی شوکتیں

اے کہ تھا سارے جہاں کو فخر تیری خاک پر
تذکرہ تیرا ملائک میں بھی تھا افلاک پر
رو رہی ہے آج حسرت تیری ارضِ پاک پر
بیکسی چھائی ہوئی ہے دیدۂ نمناک پر

ذرہ ذرہ میں جھلکتا ہے گذشتوں کا لہو
آتی ہے تیرے گلوں میں آج بھی پہلوں کی بو

آج پھر جوشِ جنوں آوارۂ محفل میں ہے
پے بہ پے تابندگی پھر داغہائے دل میں ہے
تازگیٔ عزم و ہمت عازمِ منزل میں ہے
آنکھ سے اوجھل ہے جو لیلی اس محمل میں ہے

دفن ہیں اسلاف تیری خاک گوہر پوش میں
ناز ہے جن پر تجھے وہ ہیں ترے آغوش میں

ہم نشیں چشم بصیرت کھول اس بستی کو دیکھ
اور پھر اپنی مئے غفلت کی بدمستی کو دیکھ
دیکھ پُر لعل و گہر گنجینۂ ہستی کو دیکھ
ہے اسی میں سب کچھ اس اجڑی ہوئی بستی کو دیکھ

ہے فضا رخشندہ و آصف کو کب امید سے
یہ چمن پھر بھی کھلے گا نغمۂ توحید سے

قطب مینار

اے قطب مینار اے خمیازۂ دورِ شباب
اے نقیبِ حریت اے یادگارِ انقلاب
دیکھ کر تجھ کو یہ کہتا ہے فلک پیما عقاب
اَیُّهَا الْاَرْوَاحُ حَیُّوْا ذَالِکَ شَیْءٌ عُجَاب

ارتقائے عشرت فانی کی معراج حسیں | کشور صنعت کا تو شہزادۂ گردوں طناب
تیری ہستی حامل تاریخ آثار کہن | تو نے دیکھا فاتحوں کا اوج قوموں کا شباب
شاہراہ زندگی کا ہے نشان رہ نما | یا کوئی سرکش فرشتہ آگیا زیر عتاب
یا ملائک کے اترنے کے لیے زینہ ہے تو | یا ہے چرخ بے ستوں کا اک ستون دیریاب
یا مسافر جو بچھڑ کر کارواں سے رہ گیا | کر رہی ہو جس سے کچھ سرگوشیاں حور سحاب
یا چلی آتی ہے اک امڈی ہوئی موج مہیب | یا مئے دوشیں سے کوئی دیوانا مست خراب
مظہر کر و فر شاہنشہی تیری فضا | تیری خاموشی میں ہے ہنگامۂ صد انقلاب
دشت امکاں میں بگولہ اٹھ کے قائم ہو گیا | گردشوں کی فوج بے پایاں ہے جس کے ہم رکاب
سرو آزاد اس گلستان خزاں دیدہ کا ہے | مطرب فطرت کا ہے یا ایک گم گشتہ رباب
تیری عظمت سے لجاتا ہے عروج ماہ تمام | تیری ہیبت سے لرزتا ہے طلوع آفتاب
سربلندی ہے تری بالاتر از وہم و خیال | ساکنان چرخ کو ہے تیری شوکت سے حجاب
یوں قد بالا نظر آتا ہے تیرا دور سے | جیسے ہو امیں میں اپنے رب سے موسیٰ ہم خطاب

تیری پہنائی میں پنہاں قوت اسلام ہے
تیری رفعت یادگار رفعت ایام ہے

اے عزم جواں خیز

۱۹۴۶ء

اے گردش ایام بہ تغییر جہاں خیز | اے مہر جہاں سوز بہ تنویر جہاں خیز
اے محرم خلوتکہ تقدیر جہاں خیز | اے باعث تکوین بہ تعمیر جہاں خیز

اے شاہ عرب باز بہ تدبیر جہاں خیز
اے میر جہاں میر جہاں میر جہاں خیز
اے میر جہاں خیز

شوریست ز سقائیٔ انساں بدو عالم — محجوب ز افرشتہ شدہ فطرت آدم
مشرق ہمہ باغی شدہ از ذلت محکم — مغرب ہمہ فرعون شدہ از قوت ایٹم

سالار جہاں باز بہ تسخیر جہاں خیز
اے برق طپاں برق طپاں برق طپاں خیز
اے برق طپاں خیز

ارزاں شدہ بایک دو درم خون جواناں — گردوں ہمہ معمور شد از آہ یتیماں
مغرب ہمہ بازیچۂ ابلیسیٔ انساں — مشرق ہمہ رنگیں شدہ از خون غلاماں

اے ضرغام باز بہ تادیب زماں خیز
اے شیر ژیاں شیر ژیاں شیر ژیاں خیز
اے شیر ژیاں خیز

پھر دیدۂ حق بیں پہ چلا جادوئے الموت — ہے فتنۂ الحاد سے پُر عالم ناسوت
مسجود ملائک ہوا پھر بندۂ طاغوت — پابستۂ باطل ہوا یہ طائر لاہوت

اے روح بلال حبشی ہاں باذاں خیز
ہاں شعلہ فشاں شعلہ فشاں شعلہ فشاں خیز
ہاں شعلہ فشاں خیز

محکوم تجرد ہوئی یہ فطرت آزاد — اس آتش سیال نے پگھلا دیا فولاد
صد حیف کہ عشاق کی محنت ہوئی برباد — فریاد ز محرومیٔ و ناکامی فریاد

اے شعلۂ سوزاں ز دل کوہ گراں خیز
ہاں رقص کناں رقص کناں رقص کناں خیز
ہاں رقص کناں خیز

(۴ دریا کی طبیعت میں ہے اک گردش پیہم — ہے عزم مسلسل کی بنا لغزش پیہم

ہے وجہ بقائے ابدی جنبش پیہم　　شبنم ہے یہ قطرہ نہ ہو گر جوشش پیہم

شق سینۂ افلاک زن اے موج رواں خیز

اے موج رواں موج رواں موج رواں خیز

اے موج رواں خیز

ہے دل میں ہر اک ذرے کے طوفان کی تصویر　　ہے ذرۂ ناچیز حوادث گہ تغییر

ذرے سے ہوا کرتی ہے ہنگاموں کی تعمیر　　ذرے سے بدل جاتی ہے صحراؤں کی تقدیر

اے ذرۂ رہ پست مشو خیز و جہاں خیز

ہاں چرخ زناں چرخ زناں چرخ زناں خیز

ہاں چرخ زناں خیز

یہ خاک کا پتلا تو ہوا رد کش افلاک　　ہے روح مگر پست و زبوں صورت خاشاک

پاکیزہ خیالات مگر قلب ہے ناپاک　　شاعر کے لئے وجہ اذیت ہے یہ ادراک

فارغ شدہ از مخمصۂ سود و زیاں خیز

اے پیر مغاں پیر مغاں پیر مغاں خیز

اے پیر مغاں خیز

بے کیف ہے یہ بادہ فرنگی ہو کہ رازی　　اک گھونٹ مجھے دے جو ہو صہبائے حجازی

اے وہ کہ مراد دل ہے تیرے در کا نمازی　　واصف نے لگا رکھی ہے تقدیر سے بازی

اے چارہ گر درد دل از خواب گراں خیز

اے مونس جاں مونس جاں مونس جاں خیز

اے مونس جاں خیز

روشن ہے افق پردہ مقدر کا ستارا　　مشرق سے ابھرنے کو ہے سورج کا کنارا

اٹھ رفعت گردوں سے فرشتے نے پکارا　　ہاں چیر دے اے عزم جواں سینۂ خارا

درکارگہ دہر جواں باش و جواں خیز

اے عزم جواں عزم جواں عزم جواں خیز

اے عزم جواں خیز

غلامی کی بھینٹ

سنہ ۱۹۴۶ء

گرم رفتار فوجی لاری تھی / گویا ابلیس کی سواری تھی
لعنتوں کی تھی ایک موج رواں / یا سڑک پر پہاڑ تھا غلطاں
جبر و بیداد کا بگولہ تھا / قہر یزداں کا اک نمونہ تھا
کیا کہوں آہ میں نے کیا دیکھا / ایک بچہ جھپیٹ میں آیا
ایسا کچلا گیا معاذ اللہ / جیسے پتھر کی سل پہ برگ کاہ
کٹ گیا پس گیا فگار ہوا / یاس و عبرت کا اک مزار ہوا
ایک انساں کا تھا جگر پارہ / ایک عورت کی آنکھ کا تارا
کسی مچھر کا وہ نہ تھا بچہ / چیونٹی کا نہیں تھا وہ انڈا
ابن آدم تھا ابن آدم تھا / نونہال ریاض عالم تھا
آنے والی بہار کی تمہید / جس سے وابستہ قوم کی امید
ایک جھونکا نسیم رحمت کا / اک گل تازہ باغ فطرت کا
جس کو قدرت نے گود میں پالا / اس کو گلچیں نے یوں مسل ڈالا
آہ! وہ ماں کہ جس کی گود اجڑی / آہ! وہ باپ جس کی پونجی لٹی
ہائے وہ ملک جس کا تھا دلبند / وائے وہ قوم جس کا تھا فرزند
اے غلامی یہ کیا خباثت ہے / دختِ ابلیس تجھ پہ لعنت ہے
کتنے آباد گھر بگاڑ دیئے / کیسے کیسے چمن اجاڑ دیئے

دور ہو اے چڑیل اے قحبہ
تیرے سایہ سے کانپتی ہے فضا

تو نے غنچوں کو بھی نہیں چھوڑا
اٹھ! کہ آتا ہے آگ کا کوڑا

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کا جشن سیمیں

۱۷ نومبر ۱۹۴۶ء

جہان آباد میں پھر ابر رحمت مشکبار آیا
گروہ بادہ نوشاں پھر قطار اندر قطار آیا

نگار جامعہ پر اب جوانی کا نکھار آیا
اٹھو اے دلی والو مژدہ فصل بہار آیا

ہمارے عہد پارینہ کا یہ اک عکس رنگیں ہے
کہ بست و پنج سالہ جامعہ کا جشن سیمیں ہے

یہ کیسی کاروان رفتہ کی بانگ درا آئی
یہ دل کے ساز کو کیوں چھیڑنے باد صبا آئی

یہ دلی میں فضائے خلد سے کیسی ہوا آئی
یہ کیسی عالم ارواح سے شیریں صدا آئی

ہزاروں رحمتیں قربان ان کی جانفشانی پر
کہ جن کے ہاتھ کا پودا اب آیا ہے جوانی پر

وہ شیخ الہند جو روشن منار انتہا ہدایت کا
وہ شیخ الہند جو ساحل پہ کشتی قوم کی لایا

وہ شیخ الہند جس کے عزم سے تھرا اٹھے صحرا
وہ شیخ الہند طوفانوں کو جس نے گود میں پالا

وہ جس کے سوز نے خوابیدہ ذروں کو جگایا تھا
در عظمت پہ جس کے آسماں نے سر جھکایا تھا

کوئی اے کاش جوہر کو بھی یہ مژدہ سنا آئے
کوئی اے کاش اجمل تک سلام شوق لیجائے

کوئی اے کاش انصاری کو یہ پیغام پہنچائے
کرم ہو اے صبا! گر تو ہی یہ خدمت بجا لائے

کہ ایسے میں اگر اے جانے والو تم یہاں ہوتے
تو حسن سعی پر ذاکر کے کیا کیا شادماں ہوتے

یہ دلی جس کا ہر ذرہ جہان علم و عرفاں تھا
یہ دلی جس کا ہر گوشہ سواد کوئے رضواں تھا
یہ دلی جو ولی اللہ کی حکمت کا بستاں تھا
یہ دلی جس سے جاری چشمۂ تہذیب انساں تھا

اسی کے بام و در نے بابر و اکبر بھی دیکھے ہیں
اسی نے چرخ کے بگڑے ہوئے تیور بھی دیکھے ہیں

اسی اجڑی ہوئی دلی پہ ابر مست پھر چھایا
نوا سنجان ملت نے حجازی زمزمہ گایا
پھر اپنے آپ کو تاریخ دیرینہ نے دہرایا
پھر اے داآصف کوئی بھولا ہوا افسانہ یاد آیا

مبارک جامعہ کا جشن سیمیں دلی والوں کو
سلامت ہند کا یہ عہد زریں دلی والوں کو

۱؎ شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ جنھوں نے علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا سنگ بنیاد رکھا تھا ۲؎ مولانا محمد علی جوہر۔ بانی و امیر جامعہ۔ ۳؎ مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجمل خان امیر جامعہ ۴؎ ڈاکٹر مختار احمد انصاری امیر جامعہ ۵؎ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں موجودہ شیخ الجامعہ۔

بنگال اور بہار میں قتل عام

۱۹۴۶ء

ہر جا طرف فتنہ بپا دیکھ رہا ہوں
چھائی ہوئی وحشت کی گھٹا دیکھ رہا ہوں
جنت میں جہنم کی فضا دیکھ رہا ہوں
ابلیس پہ آدم کی قبا دیکھ رہا ہوں
یہ ہند ہے انساں کا وطن واہ رے انساں
کیا دیکھنے آیا تھا میں کیا دیکھ رہا ہوں
آدم کا یہ فرزند کہ ہے مقصد تکوین
کٹتا ہوا اے جرم و خطا دیکھ رہا ہوں
نوخیز جوانوں کی تڑپتی ہوئی لاشیں
بوڑھوں کے جسد بے سر و پا دیکھ رہا ہوں
مرجھائے ہوئے غنچوں کے انبار زمیں پر
گلشن میں یہ طوفان بلا دیکھ رہا ہوں
وہ خنجر سفاک وہ معصوم نگاہیں
یہ رزمگہ بیم و رجا دیکھ رہا ہوں

لٹتی ہوئی ماؤں کی بلکتی ہوئی آہیں
اف! زلزلہ ارض و سما دیکھ رہا ہوں

ہیں خون میں آلودہ عروسوں کی جبینیں
یہ غازۂ خون شہدا دیکھ رہا ہوں

اجڑی ہوئی دوشیزہ کی اٹھتی ہوئی نظریں
اٹھتی ہوئی نظروں کی دعا دیکھ رہا ہوں

جس حسن و جوانی کی گدائی کریں حوریں
اس حسن و جوانی کو گدا دیکھ رہا ہوں

ناموس وطن چاک جگر خاک بسر ہے
بربادیٔ ناموس و حیا دیکھ رہا ہوں

یہ ہے؟ وہی انسان جو مسجود ملک ہے
انساں کی ولایت میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں

ہے دیس میں آدم کے عزازیل کی شاہی
یہ شان بھی اے میرے خدا دیکھ رہا ہوں

اپنوں کی نگاہیں بھی غضب ناک و جفا جو
غیروں میں بھی فقدان وفا دیکھ رہا ہوں

اغراض کے بندوں پہ عنایات کی بارش
اللہ کے بندوں پہ جفا دیکھ رہا ہوں

ہنستا ہے خرد مند رضا کیش پہ منعم
ہنستی ہوئی منعم پہ قضا دیکھ رہا ہوں

زر دار تو صہبائے قبا دن میں ہے سرشار
نادار کی آہوں کو رسا دیکھ رہا ہوں

اس واصف مجبور نے کیا ٹھانی ہے دل میں
کچھ آج اسے تلخ نوا دیکھ رہا ہوں

میرا وطن

۱۹۴۶ء

اے ہم نشیں وطن کی مرے داستاں نہ پوچھ
لوٹا ہے کس نے آہ! مرا آشیاں نہ پوچھ

اے دوست شرح عقدۂ سود و زیاں نہ پوچھ
کن وادیوں میں ڈوب گیا کارواں نہ پوچھ

افسانۂ خرابیٔ زندانیاں نہ پوچھ
کیونکر گزاری جاتی ہیں راتیں یہاں نہ پوچھ

کس طرح لوٹی جاتی ہے شادابیٔ چمن
کیونکر اجاڑی جاتی ہیں آبادیاں نہ پوچھ

ہے نقد عمر نذر سبک گامیٔ بہار
ہے زندگی غریب پہ کتنی گراں نہ پوچھ

افلاس و غمانہ جنگی و اندیشۂ عدو
کیا کیا ہوئے ہیں آہ! مرے امتحاں نہ پوچھ

اپنوں سے قطع کر کے وفا کی تھی غیر سے
کیسی مری وفا کی اڑیں دھجیاں نہ پوچھ

قابیل کی ہے روح کو کیا کیا نشاط و ناز
انسانیت کے خون کی ارزانیاں نہ پوچھ

اس تیرہ سر غلام کو دعوائے خسروی!
کیا کیا فلک نے مجھ پہ کہیں پھبتیاں نہ پوچھ

اظہار حق کو جرأت اخلاق چاہیئے
اے بدگماں حقیقت راز نہاں نہ پوچھ

منزل سے بے خبر ہے مثال نشان راہ
سالار کارواں کی فسوں کاریاں نہ پوچھ

محمل کی جستجو ہے بایں عمر چند روز
اے ہم نفس حدیث غم گمرہاں نہ پوچھ

انجام کا خیال نہ مقصد سے آشنا
واصف فریب خوردگیٔ کارواں نہ پوچھ

فریب قیادت

۱۹۴۶ء

باریابی ہو اگر ان رہبران قوم تک
اے صبا کہنا کہ دل میں کچھ بھی شرماتے ہو تم

کچھ خیال آتا بھی ہے؟ افتادگان راہ کا
موٹروں میں جب بصد حشمت گزر جاتے ہو تم

جن کے تم رہبر بنے وہ لوگ رہتے ہیں کہاں
ان کی بستی کی طرف بھی کیا کبھی جاتے ہو تم

کس طرح کٹتی ہیں راتیں کس طرح جاتے ہیں دن
کیا کبھی ان خستہ حالوں پر ترس کھاتے ہو تم

نام لیواؤں سے اپنے کچھ تعلق ہے تمھیں
کیا غریبوں کو بھی اپنا جلوہ دکھلاتے ہو تم

لٹ گیا اپنا وطن اور تم خبر کے منتظر
یوں تو لندن اور کناڈا کی خبر لاتے ہو تم

آہ! کیا کافی نہ تھا بازیچۂ خون ضمیر
آدمی کے خون سے کیوں شغل فرماتے ہو تم

کیا یہ گردن حق کے آگے بھی جھکاتے ہو کبھی
اپنے ہم جنسوں کے آگے جس کو اکڑاتے ہو تم

ان خداوندوں سے بالاتر بھی ہے کوئی خدا
جن کی جھوٹی قوت و شوکت پہ اتراتے ہو تم

یہ قیادت تابہ کے؟ یہ مال و دولت تاکجا
چلتی پھرتی چھاؤں پر کیوں ناز فرماتے ہو تم

شاہجہان آباد اور انقلاب ۱۹۴۷ء

سن اے ستارۂ صبح وطن مری روداد
سن اے بہار دل زخم خوردہ کی فریاد

شکایت الم سرد مہری یاراں
حکایت غم ویرانیٔ جہان آباد

سواد منزل الفت نظر نہ آیا تھا
کہ خاک و خوں میں ہوئی غرق محنت فرہاد

یہ خاک خطۂ دہلی کہ جس کا چشمۂ فیض
رسیدہ تا بہ بخارا و کابل و بغداد

پھر آج خون مسلماں سے ہو گئی رنگیں
کہ خوب تر ہے یہ گلگونۂ عروس بلاد

لٹی ہے عزت و ناموس نازنین حرم
چلا ہے گردن طفلاں پہ خنجر جلاد

نہ جان کو ہے اماں اور نہ آبرو محفوظ
زچیرہ دستیٔ وبیداد ہندیاں فریاد

ہزار سالہ تمدن کی یادگار لٹی
کہو ظفر سے کہ دلی کی پھر بہار لٹی

پھر آج دل میں بپا رنج و غم کا طوفاں ہے
پھر آج و آصف برگشتہ بخت گریاں ہے

لٹے ہوئے ابھی نوے برس ہی گزرے تھے
پھر آج دلی میں مسلم کا خون ارزاں ہے

شریک کار جو آزادیٔ وطن میں ہوئے
اب ان پہ تنگ زمین وطن کا داماں ہے

ہوئے ہیں دشمن جاں گھر کے ہی در و دیوار
وطن میں آج غریب الوطن مسلماں ہے

یہ کس سے پوچھیں کہ ہم کیا کریں کدھر جائیں
جدھر بھی دیکھو ہر اک عاجز و ہراساں ہے

دبال دوش ہے بار حیات اب تو یہاں
کسے خیال ہلاکِ متاع و ساماں ہے

یہ جوش نفرت و بیگانگی معاذ اللہ
کہ ذرہ ذرہ یہاں آبرو کا خواہاں ہے

پھر اپنے چاہنے والوں سے چھٹ گئی دلی
صبا! یہ ذوق سے کہنا کہ لٹ گئی دلی

جلا وطن جو ہوئے ان کا حال کیا ہو گا
دلوں کے زخموں کا اب اندمال کیا ہو گا

ہو بیگناہوں کی لاشوں پہ جس محل کی بنا
مجھے یہ فکر ہے اس کا مآل کیا ہو گا

وطن سے روٹھ گئے تم مگر سنو تو سہی
وطن میں اپنے عزیزوں کا حال کیا ہوگا
دم وداع جو رسم وفا کو بھول گئے
ہمارے قتل کا ان کو ملال کیا ہوگا
کھلی فضاؤں میں گلشن کی کھیلنے والو
تمھیں تو مرغ قفس کا خیال کیا ہوگا
یہ بے نیازئ ساحل یہ وسعت طوفاں
اسیر موج کا واصف مآل کیا ہوگا

اب اجنبی وہ ہوئے جن سے چاہ تھی دل کو
گئے وہ جن سے کبھی رسم و راہ تھی دل کو

نشاں بہار گزشتہ کا پا نہیں سکتے
جو مٹ چکے ہیں وہ اب ہاتھ آ نہیں سکتے
ہمیں تو صفحۂ دل سے مٹا دیا تم نے
مگر یہ داغ فضیحت مٹا نہیں سکتے
سنائیں کیا کہ کلیجہ ہی موتھ کو آتا ہے
کسی کو چیر کے سینہ دکھا نہیں سکتے
سمٹ کے چار طرف سے ہوئے ہیں یوں محصور
کہ باہر اپنے علاقے سے جا نہیں سکتے
یہ حکم ہے کہ نہ ہو امن عامہ میں خلل
کسی کو اپنی کہانی سنا نہیں سکتے
گماں ہے ان کو بغاوت کا ہم غریبوں پر
جو معذرت کے لئے لب ہلا نہیں سکتے

حذر کہ دست قضا سست ہو نہیں سکتا
حذر کہ کاتب تقدیر سو نہیں سکتا

انقلاب ۱۹۴۷ء

خوشی یہ تھی کہ ہمارا یہ "لالہ زار" وطن
فرنگیوں کی غلامی سے ہوگا جب آزاد
ملے گا چین غلامی کی آفتوں سے ہمیں
رہے گا ہند میں ہر فرد خورم و دل شاد
کریں گے مل کے سب اہل وطن چمن بندی
کریں گے از سر نو اجڑی بستیاں آباد
کسی کے مذہب و ملت پہ کچھ نہ ہوں گے قیود
ہجوم فکر سے ہوگا دل و دماغ آزاد
ملے گی فاقہ کشی سے جفاکشوں کو نجات
غریب کا بھی مسرت سے ہوگا گھر آباد
نہ رشوتیں نہ جرائم نہ رہزنوں کا خطر
بپا نہ ہوگا کبھی ملک میں قتال و فساد

نظر اٹھائی تو دیکھا کہ غرقہ خوں ہے
زمینِ صوبۂ لاہور تا جہان آباد
کھلا یہ اب کہ نہ تھا اہل اس امانت کا
یہ آدمی جو ہے آدم کی ناخلف اولاد
یہ جس کے سر پہ مسلط جنون و وحشت ہے
یہ جس کے دل میں بھرا ہے نفاق و بغض و عناد
وطن کی عزت و ناموس کو کیا ناراج
دقار فطرت انساں کو کر دیا برباد
کلاہ عظمت اشراف اور یہ دست دراز
زکج نہادئ و بدکیشیٔ جہاں فریاد
یہ ماؤں بہنوں کے سینے یہ تیغ و تیر و تفنگ
یہ ننھے ننھے سے بچے یہ خنجر فولاد
فلک نے دی نہ ہمیں مہلت ثبوت وفا
ہوئے پنپنے سے پہلے ہی کشتۂ بیداد
بس اے وفور تمنا کہ خاک و خوں میں ملی
تصورات کی وہ جنت طرب آباد

خطا معاف! کہ اب ہم کو یاد آتا ہے
وہ دور جب کہ غلامی سے ہم نہ تھے آزاد

ہائے میری دلی

ہم سفر تھم تو سہی دل کو ٹھہر جانے دے
روح درماندۂ آلام ہے ستانے دے
یہ زمیں کونسی ہے مجھ کو کہاں تو لایا؟
کیوں مجھے عہد گزشتہ کا تصور آیا؟
اے کہ اقدام سفر شام و سحر ہے تجھ کو!
دیکھ کیا ہیں وہ کھنڈر سے یہ خبر ہے تجھ کو!
دل کھنچا جاتا ہے اس منزلِ ویراں کی طرف
سر جھکا جاتا ہے اس گرد بیاباں کی طرف
یہ دل زار کی ٹوٹی ہوئی کشتی تو نہیں؟
ہم سفر آہ یہ اجڑی ہوئی دلی تو نہیں؟
ہاں یہی ہے مری دلی مری پیاری دلی
ہاں مری بچھڑی ہوئی راج دلاری دلی
ہاں اسی کوچے ہیں میں خاک اڑاتا تھا کبھی
ہاں اسی خاک کو میں سرمہ بناتا تھا کبھی
ہم سفر ہاں انھیں ذروں سے شناسائی تھی
غم الفت نے یہیں نشو و نما پائی تھی
میری پیشانی جو سجدے میں گئی تھی پہلے
ہے یہی خاک جو چہرے پہ لگی تھی پہلے
جس کی تاریخ نے عزت سے شناسائی دی
جس کی مٹی نے رگ و پے کو توانائی دی

آکہ ایامِ گزشتہ پہ بہالیں آنسو | کاش بیتے ہوئے لمحات کو پالیں آنسو
اشکِ عبرت سے تخیل کو ہم اپنے دھو لیں | آکہ اس منبر و محراب سے مل کر رو لیں
کاروانِ دلِ گم گشتہ کی منزل ہے یہی | خونِ صد حسرت و ارمان کا حاصل ہے یہی
یہ ہنرگاہ یہ شاہانِ وطن کا مسکن | یہ دبستانِ عزیزؔ اور ولیؔ کا گلشن
لٹ گئی آج پھر اس گلشنِ حکمت کی بہار | مل گیا خاک میں تہذیبِ گزشتہ کا وقار
کس نے آثارِ قدیمہ کو کیا ہے مسمار؟ | کیا یہی ہوتے ہیں اقوامِ مہذب کے شعار؟
کیا یونہیں ملتا ہے انسان کو دنیا میں عروج | کیا نہتوں پہ یونہیں ہوتا ہے فوجوں کا خروج
رائگاں کیا کہیں قوموں کا لہو ہوتا ہے | یہ تو اک بندۂ صابر کا وضو ہوتا ہے
تابش آموز ہے وہ گوہرِ غلطاں اب تک | خاک آلودہ ہے پھر بھی ہے درخشاں اب تک
جوئے خوں بہتی ہے پیکانِ خلیدہ سے ابھی | بوئے تیغ آتی ہے پہلوئے دریدہ سے ابھی
عزمِ صادق سے ہے معمور دماغِ کشتہ | لو نہ دے جائے کہیں دودِ چراغِ کشتہ
زندہ ہیں خیرِ امم کی وہ روایات ابھی | ثبت ہیں لوحِ زمانہ پہ وہ آیات ابھی

گو ستم دیدۂ واماندۂ ایام ہے یہ
ہوشیار اے فلکِ پیر کہ اسلام ہے یہ

قومی ترانہ

گلشن میں جب کلیوں نے چٹک کر جے ہند پکارا | مشرق پہ خدا نے آزادی کا انعام اتارا
رحمت کی برکھا نے پھولوں کا رنگ روپ نکھارا | سورج کی کرنوں نے بھارت کی زلفوں کو سنوارا

سنسار چمک اٹھا سارا
کیا ہی پیارا دیس ہمارا

اس دیس میں ہیں کیسے کیسے گیانی عالم دانا | سمجھا ہے جن پر دنیا کی سرداری کا بانا
مہمان مسافر پردیسی اور اپنا بیگانہ | ہم نے سب کو پلایا اپنی الفت کا پیمانہ

سب کی امیدوں کا سہارا

کیا ہی پیارا دیس ہمارا

پورب میں برما، اتر میں تبت روس ہمالا — پچھم میں فارس کابل دکھن میں سمندر لنکا

پربت کو دیکھو تو دنیا میں ہے سب سے اونچا — سر پر برف کا تاج اور دامن میں چشمے اور دریا

سونے چاندی کا گہوارہ

کیا ہی پیارا دیس ہمارا

کیسا نکھرا ستھرا جمنا اور گنگا کا پانی — دلّی کی آن نرالی کاشی کی شان سہانی

ہیبت کا مندہ دل کا بہادر ہے ہر ہندستانی — جگ میں سورج بن کے چمکتی ہے بھارت کی کہانی

دنیا کی آنکھوں کا تارا

کیا ہی پیارا دیس ہمارا

صبح سویرے چڑیوں نے وآصف کا ترانہ گایا — میٹھے میٹھے نغموں نے سوتوں کے من کو جگایا

پھولوں نے ہنس کر آزادی کا پیغام سنایا — بھارت کے سپوتوں نے اپنی محنت کا پھل پایا

روشن ہے قسمت کا ستارا

کیا ہی پیارا دیس ہمارا

ہندو مسلم سکھ عیسائی سب تجھ میں سکھ پائیں — پریم کی برکھا برسے اور دل سے سب گھل مل جائیں

ہمسائے کے بسنے والے بھی تیری خیر منائیں — تاریخ کے لکھنے والے بھی تیرے گن گائیں

بہتا رہے دولت کا دھارا

کیا ہی پیارا دیس ہمارا

ایک نکتہ چین اور شاعر

۱۹۴۹ء

یوں گلہ مند آج ہے شاعر سے ذہن نکتہ چیں — اب غزل میں تیری وہ رنگ تغزل کیوں نہیں

کیوں گل و بلبل کے افسانوں سے نفرت ہے تجھے
کیوں وصال و ہجر کے قصوں سے وحشت ہے تجھے

عشق و مستی موسم گل جوش مل ابر بہار
یہ جوانی اور یہ بے کیفیٔ بلبل و بہار

شعر ہیں تیرے خمار و ساغر و مینا نہیں
نغمۂ و رقص و سرود و نشۂ و صہبا نہیں

آج وہ شوق و تمنا کی کہانی کیا ہوئی
شوخیٔ مضمون و تخلیق معانی کیا ہوئی

شاعر شیریں نوا اب کیوں ہے اتنا تلخ کام
آج کیوں بدلا ہوا ہے تیرا انداز کلام

بات میں تیری تاثر ہے سیاسیات کا
شعر تیرا آئینہ ہے صورت حالات کا

تیرے چہرے سے نمایاں منظر اندوہ و یاس
محفل عیش و مسرت میں بھی رہتا ہے اداس

کیا تجھے معلوم ہے؟ تیرا وطن آزاد ہے
کیوں ترا احساس پنہاں آج بھی ناشاد ہے

سن کے شاعر نے کہا اے میرے ناداں نکتہ چیں
کیا کہوں اب شعر میں میرے تغزل کیوں نہیں؟

فکر تیرا ہے رہین نقشہ ہائے آب و گل
ترجمان راز ہست و بود ہے شاعر کا دل

ملک بھی آزاد ہے اور قوم بھی مسرور ہے
ہاں مگر انساں ابھی انسانیت سے دور ہے

سانس اگر دنیا میں اطمینان کا لیتا ہے تو
آہ! دھوکا خود ہی اپنے نفس کو دیتا ہے تو

پوچھ آزادی کی لذت بیکس و نادار سے
دھوپ شرمانی ہے جس کی زردیٔ رخسار سے

آج خود انسان سے انسانیت رنجور ہے
آہ! یہ فرزند آدم کس قدر مغرور ہے

بھوک اور غم کے گراتا ہے غریبوں پر پہاڑ
لہلہاتے سبزہ زاروں کو یہ کرتا ہے اجاڑ

نیکیٔ و اخلاق سے یکسر تہی داماں ہے یہ
چند روزہ دولت و اقبال پر شاداں ہے یہ

آج بھی انسانیت شیطان کی محکوم ہے
روح کی عظمت سے اب بھی آدمی محروم ہے

جرم کرنے کے لئے ویدوں کی لیتا ہے پناہ
نام پر قرآن کے کرتا ہے تکمیل گناہ

حشر برپا کر رہا ہے ایٹمک ذرات سے
کام کیا لیتا ہے یہ قدرت کے انعامات سے

خواہشات نفس کا یہ سفلہ اب بھی ہے غلام
خوب سمجھا تو نے آزادی کا مفہوم و مقام

آج اس انساں کی عالم میں کیا کیا دھوم ہے
مادر گیتی کا دل اف کس قدر مظلوم ہے

کیوں ہوا تو میرے اندازِ سخن پر حرف گیر
کیا کہیں اے دوست! مجرم تو نہیں تیرا ضمیر؟

میں جو رکھتا ہوں رگِ انسانیت پر نیشتر
کیوں تڑپ جاتا ہے تو محسن کش شوریدہ سر

گفتگو سے میری بوئے طنز آتی ہے تجھے
بات میری چور سا گویا بناتی ہے تجھے

بیقراری سے مری مجرم بنا جاتا ہے کیوں
دل ہی دل میں میری باتوں سے گھٹا جاتا ہے کیوں

آہ! ناداں تو نے شاعر کو ابھی سمجھا نہیں
تو نے اس کے جوہرِ تخلیق کو پرکھا نہیں

یہ دلِ آگاہ و دانا۔ ہے امانت قوم کی
جذبۂ حق کو چھپانا۔ ہے خیانت قوم کی

مسلم و ہندو سے بالاتر ہے شاعر کی نظر
دیکھ کر دنیا کو دکھ جاتا ہے شاعر کا جگر

کانپ جاتا ہے مگس کی ناگہاں فریاد سے
سیکھ رازِ دردمندی شاعرِ ناشاد سے

اپنے گرد و پیش سے دل کو بچا سکتا نہیں
اپنے احساسات کو شاعر چھپا سکتا نہیں

گو خلافِ طبعِ نازک تلخیٔ گفتار ہے
چپ رہے شاعر تو ملک و قوم کا غدار ہے

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ لے آتا ہوں میں
ہاں وطن کی شرطِ خدمت یوں بجا لاتا ہوں میں

آ سناؤں تجھ کو قولِ شاعرِ یکتائے قوم
آہ! وہ اقبال جو تھا دیدۂ بینائے قوم

"قوم گویا جسم ہے افراد ہیں اعضائے قوم
منزلِ صنعت کے رہ پیما ہیں دست و پائے قوم

محفلِ نظمِ حکومت چہرۂ زیبائے قوم
شاعرِ رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ"

واصفِ برگشتہ قسمت کو نہ چھیڑ اے ہم نشیں
اس کے نغموں سے نہ تو مغموم ہو جائے کہیں

نفس کی طغیانیوں سے دل بہت مجبور ہے
یہ کلیمِ مضطرب محتاجِ برقِ طور ہے

کس کی آزادی

۱۹۵۰ء

اک مفلسِ نادار سے جب میں نے کہا
خوش ہو کہ وطن اپنا ہوا ہے آزاد

یوں رو کے کہا اس نے کہ ہم ہیں بھو کے
ہنستے ہیں مگر گلشن دل ہے برباد

آزادیٔ و عشرت ہے امیروں کے لئے
ہم پہلے سے بدتر ہیں حزین و ناشاد

اجلے ہیں لباس اور ہیں جیبیں خالی
فریاد! زبید اد تونگر فریاد

واصف تو قلندر ہے مگن ہے ہردم
کچھ بھی ہو مگر آج وطن ہے آزاد

اعلان جمہوریت
۱۹۵۰ء

ملک اپنا بھی آج ہے آزاد
جشن جمہوریت مبارک ہو

رفت و منزل بدیگرے پرداختن
منزل حریت مبارک ہو

نعمت سر خوشی سلامت باد
عزت و مکرمت مبارک ہو

یوں بھی پھرتا ہے رخ زمانے کا
سطوت و منزلت مبارک ہو

ہند کو اے خدائے پست و بلند
تیری یہ مرحمت مبارک ہو

یہ بھی قدرت کی اک امانت ہے
ذمۂ سلطنت مبارک ہو

داد خواہوں کا ازدحام ہے آج
عہد پر معدلت مبارک ہو

آدمیت کی آزمائش ہے
دور جمہوریت مبارک ہو

شعر واصف سے گرم ہے محفل
قطعۂ تہنیت مبارک ہو

جشنِ جمہوریت کا عظیم الشان مشاعرہ

قلعہ معلی کی شہ نشین پر

(بصدارت پنڈت دتاتریہ کیفی)

۱۹۵۰ء

گلستاں پر بصد حسرت گھٹا پھر اشکبار آئی
ہزاروں حیرتیں دامن میں لیکر پھر بہار آئی
نشے میں جھومتی پھر گردشِ لیل و نہار آئی
جماعت بادہ خواروں کی قطار اندر قطار آئی

وہ دیکھو انگڑائیاں لیتا ہوا عہدِ شباب آیا
ادھر آ ساقیٔ ہوش کہ پھر دورِ شراب آیا

پلا ساغر مجھے ایسا کہ خود کو بھول جاؤں میں
لرز اٹھیں در و دیوار ایسا گیت گاؤں میں
وہ شانِ نغمہ سنجی دے کہ سوتوں کو جگاؤں میں
پھر ان روٹھی ہوئی روحوں کو جنت سے بلاؤں میں

مرے نقدِ ہنر کو دیدۂ "عالی گہر" آئے
مری داد تغزل کے لئے "روح ظفر" آئے

چلو اے بلبلو! ہنگام مشق پر فشانی ہے
ظفر کی اجڑی محفل میں ہماری نغمہ خوانی ہے
جو ان اہل چمن کو داستانِ دل سنانی ہے
اگر سمجھو تو عبرت ہے وگرنہ اک کہانی ہے

بصد ناز و ادا وہ زینتِ محفل بھی آئے گا
سنا ہے آج اس محفل میں وہ قاتل بھی آئے گا

کہاں ہے شمع اب دل کی لگن کی آزمائش ہے
وقار و ضبط اہلِ انجمن کی آزمائش ہے
زباں پر قفل اور تابِ سخن کی آزمائش ہے
اندھیرے گھر میں پھر داغِ کہن کی آزمائش ہے

یہاں "فردوس ارضی" میں جگر رنجور ہے میرا
کہ ذکرِ این و آں سے دل ابھی معمور ہے میرا

قفس کی تیلیوں میں بال و پر کی آزمائش ہے — درِ زنداں ہے اور شوریدہ سر کی آزمائش ہے
رگِ احساس غم پر نیشتر کی آزمائش ہے — سنبھل جوشِ جنوں قلب و جگر کی آزمائش ہے

علی الرغم غمِ دورِ زماں اک جام دے ساقی
بیادِ عظمتِ "شاہ جہاں" اک جام دے ساقی

نظر شاعر کی ہر ذرے میں عبرت ڈھونڈ لیتی ہے — دلِ شاداں میں بھی پنہاں اذیت ڈھونڈ لیتی ہے
ہر اک افتادہ پائی میں عزیمت ڈھونڈ لیتی ہے — سکوں پرور فضاؤں میں قیامت ڈھونڈ لیتی ہے

نہ تھا معلوم الفت میں خوشی بھی قہر ہوتی ہے
مریضِ غم کو مصری کی ڈلی بھی زہر ہوتی ہے

اجڑ جائے جو دل اپنا تو رو دینا ہی پڑتا ہے — خرد کو وادیٔ وحشت میں کھو دینا ہی پڑتا ہے
سرشکِ خوں سے دامن کو بھگو دینا ہی پڑتا ہے — جو دل ڈوبے تو خود کو بھی ڈبو دینا ہی پڑتا ہے

ہوا ٹھنڈی جو چلتی ہے تو ہوتی ہے کسک دل میں
جگر کے داغ جلتے ہیں تو ہوتی ہے چمک دل میں

وہ بوڑھا شیر جو سویا ہوا ہے تختِ غربت پر — نگاہ جبرئیل قربان اس کے خوابِ راحت پر
فلک بھی محوِ حیرانی تھا جس کے عزم و جرأت پر — شہیدانِ وطن نے خوں بہایا جس کی حرمت پر

بہارِ عظمتِ آخر کا جو عنوانِ رنگیں تھا
بقولِ غالبِ خستہ جو شمعِ بزمِ دوشیں تھا

وہ شمعِ حریت جس نے فروغِ آبرو دیکھا — وہ جس نے اپنے پروانوں کا عزمِ جستجو دیکھا
وہ جس نے ملک و ملت کے شہیدوں کا وضو دیکھا — وہ جس نے مسکرا کر اپنے بیٹوں کا لہو دیکھا

جو اب بھی اپنے مرقد میں وفا کا عہد لیتا ہے
وطن کے نوجوانوں[۱] کو آج بھی آواز دیتا ہے

اسی کی جلوہ گہ میں آج ہے بزمِ غزل خوانی — کریں گے سرخوشاں جامِ دولت گوہر افشانی

[۱] سبھاش چندر بوس

یہیں ہوگا سرود سطوت و رقص جہاں بانی یہیں ہوگی غم ہستی کی خون دل سے مہمانی

نگاہ عبرت آگیں نے عجب دورِ جہاں دیکھا
زمیں کو دیکھ کر پھر میں نے سوئے آسماں دیکھا

مبارک ہو کہ آزادی ملی ہے ہند والوں کو ملے گی پیٹ بھر کر اب تو روٹی خستہ حالوں کو
میسر ہوگی رفعت زیر دستوں پائمالوں کو ملے گی داد نغمہ گستری شیریں مقالوں کو

پھر آیا یاد مجھ کو شاہد نامہرباں ساقی
نہ دے چھینٹے کہ خاک دل سے اٹھتا ہے دھواں ساقی

سر بزم آج دل کی بات ظاہر ہوتی جاتی ہے کہ ہمت شدت بادہ سے قاصر ہوتی جاتی ہے
کہانی تیری و آصف بار خاطر ہوتی جاتی ہے یونہیں سنتے سناتے رات آخر ہوتی جاتی ہے

بنام سائل مسکیں نواز اک جام دے ساقی
کہاں میں اور کہاں تسکیں خدا کا نام لے ساقی

شہیدانِ جبلپور

۱۹۶۱ء

اے عازم دربار شہنشاہ مدینہ یاد آئیں اگر تجھ کو شہیدان جبلپور
کہنا بصد آداب کہ اے مرکز امید بدلے گئے کیوں بارگہ ناز کے دستور
یادہ ترے الطاف و عنایات کا عالم دشمن کا بھی دامن ترے احسان سے معمور
کوتاہ قراءت ہوئی اک طفل کی خاطر دل رحمت و شفقت سے ہوا تھا ترا معمور
بے چین ہوا دل ترا بچے کی صدا سے روتا ہے ہر اک طفل جو ماں ہو کہیں مستور
یا آج یہ ہے شان تغافل کہ غضب ہے کیا کچھ نہ ہوا زیر فلک آہ! جبلپور
کہنے کے لئے چاہیئے پتھر کا کلیجہ ہم کیا کہیں کیونکہ کہیں ہرگز نہیں مقدور
تھرا اٹھے عبرت سے بیابان و جبل بھی اغیار کے دل جس کے تصور سے ہوئے چور

ان میں بھی تو اطفال تھے اے رحمتِ عالم
سینوں سے جو لپٹے ہوئے شعلوں میں تھے محصور

حیرت ہے کہ یہ حادثہ امت پہ جو گزرا
کیوں رہ گیا آقا کی نگاہوں سے یہ مستور

ایسی بھی غلاموں سے خطا کیا ہوئی سرزد
افسوس کہ ایسے ہوئے ہم راندۂ و مقہور

گو بادۂ عصیاں کا نشہ ہم پہ ہے طاری
مانا کہ ہوئے ہم بہت آزادہ و مغرور

لیکن ہے خطا کاروں کا اک تو ہی سہارا
تو ہی جو خفا ہو تو کہاں جائیں یہ مجبور

نسبت ہے ہمیں تجھ سے کچھ اس کی بھی رہے لاج
غیروں سے تو فریاد نہیں ہے ہمیں منظور

یہ خونِ وطن کو تری امت نے دیا ہے
حاضر ہیں ترے در پہ شہیدانِ جبلپور

عشقیہ نظمیں

شکوۂ ہجر

نالہ جانو نہ اسے سمجھو نہ فریاد اسے   دل کے ٹکڑے ہیں جو سینے سے میں آئے لب تک
آہ! جلتا رہوں کب تک میں جدائی میں تری   یاد میں تیری یہیں روتا رہوں پہروں کب تک
ہائے وہ دن بھی کبھی ہوگا کہ میں ہوں تو ہو   لیکن امید نہیں جینے کی مجھ کو جب تک
نقش ہے دل پہ مرے تیری جدائی کا سماں   یاد ہیں تیری محبت بھری نظریں اب تک

وقت رخصت ترا مل مل کے ہراساں ہونا
میں نہ بھولوں گا ترا اشک بداماں ہونا

آہ! کیا تجھ کو بھی احساس مرے غم کا ہوا   کیا ترا دل بھی نہ ہونے سے مرے شاد نہیں
تیری نظریں بھی کبھی ڈھونڈھتی رہتی تھیں جسے   میں وہی سوختہ دل ہوں تجھے کیا یاد نہیں
لیکن اب ڈھونڈھ رہی ہیں مری آنکھیں تجھ کو   کوئی دم قید تصور سے دل آزاد نہیں
ہے نگاہوں میں مری ساری خدائی تاریک   میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کہیں آباد نہیں

یاد آتی ہیں تری پیار کی باتیں مجھ کو
خون رلواتی ہیں تنہائی کی راتیں مجھ کو

منزل آغاز الفت

اے دل تو اپنی منزل الفت کو دیکھ لے   اے چشم نم مزار مسرت کو دیکھ لے

کچھ یاد ہے کہ کون تھا ہمدم یہاں ترا — اک کامیاب وقت کی مدت کو دیکھ لے
مدفن ہے حسرتوں کا یہی منظر خموش — خوابیدہ اس سکوت میں قسمت کو دیکھ لے

ہے یہ مقام تیری مسرت کی یادگار
آنسو بہا کہ ہے یہ محبت کی یادگار

اک لمحۂ طرب نے رلایا تمام عمر — اے کاش عمر یونہی گزرتی فراق میں
ہو جاتا دل میں جذب غم عشق و درد ہجر — دل سے اک آہ بھی نہ ابھرتی فراق میں
بیتابیوں میں عشق کی ہوتی فنا اگر — جان اس کی آرزو بھی نہ کرتی فراق میں

مجبور دل تھا چہرے کو غم پاش کر دیا
آہوں نے اس پہ سوز نہاں فاش کر دیا

دل میں ہے میرے نخل تمنا ابھی ہرا — دیدار کی ہوس مرے ناشاد دل میں ہے
جذبات سوختہ میں چمکتی ہیں حسرتیں — ہنگامہ ایک آرزوِ منفعل میں ہے
اف کیا کروں کہ ضبط کی طاقت نہیں رہی — اف کیسا اضطراب دل مضمحل میں ہے

جس دل میں تاب رنج تھی وہ دل نہیں رہا
اب درد عشق ضبط کے قابل نہیں رہا

گزرا ہوا وقت

ذرا نغمہ نوائے بلبل خوش نوا — گیا وقت پھر یاد آیا مجھے
ٹھہر اے خیال حبیب بعید — یہ سچ ہے کہ تو نے بھلایا مجھے
مگر یاد ہیں تیری رعنائیاں — زمانے نے کیسا چھڑایا مجھے
نہ تھی گو مرے دل میں تاب فغاں — جدائی نے تیری رلایا مجھے
مصیبت ہے میرے لئے زندگی — ستاتا ہے اپنا ہی سایا مجھے
شریک تمنا کوئی اور ہے — مقدر نے کیا کیا دکھایا مجھے

اذیت میں آفت میں تکلیف میں — دل بے وفا نے پھنسایا مجھے
میں گو اس امانت کے قابل نہ تھا — اداؤں نے تیری لبھایا مجھے
مجھے یاد ہیں وہ وفائیں تری — کبھی میں جو روٹھا منایا مجھے
کبھی میں نے رو کر رلایا تجھے — کبھی تو نے ہنس کر ہنسایا مجھے
وہ دن زندگی میں جو دیکھا نہ تھا — وہ دوری نے تیری دکھایا مجھے
کہاں جاؤں کیونکر کہوں حال دل — کہ طرز فغاں بھی نہ آیا مجھے
غم ہجر نے دل کو ویراں کیا — جنوں دشت وحشت میں لایا مجھے
یہ دل غم اٹھانے کے قابل نہیں — کوئی اور دل دے خدایا مجھے
کسی اور عالم میں جا کر رہوں — کہ دنیا میں رہنا نہ بھایا مجھے

ذرا تھم تو اے واصف خوش نوا
کہ نغموں نے تیرے رلایا مجھے

عید کا چاند

انعام ولطف عام ہے رب وحید کا — آیا ہے آسمان سے پیغام عید کا
ہر سمت آج عیش ومسرت کا دور ہے — برپا زمیں پہ شور ہے ہل من مزید کا
لیکن ہلال عید کے جلوے کو دیکھ کر — خوں ہو گیا کسی کی تمنائے دید کا
ہجراں نصیب دل کو ہو کیا عید کی خوشی — دم گھٹ رہا ہے شام سے ہی نا امید کا

آنکھوں کو جستجو ہے کسی اور چاند کی
دل کو ہے انتظار کسی اور عید کا

اشک حسرت

کہانی اپنی بربادی کی دنیا کو سناتا ہوں — دکھا کر دل کی حالت پتھروں کا دل دکھاتا ہوں
ذرا دل تھام کر سن تو بھی ان پر درد نغموں کو — کہ میں سینے سے آہیں کھینچ کر کاغذ پہ لاتا ہوں

تصور سے ترے ہر وقت روشن میرا سینہ ہے
کہ تاریکی میں خلوت کی میں اپنا دل جلاتا ہوں

وہی میں ہوں وہی دل ہے وہی ہیں منتظر آنکھیں
کبھی تنہائیوں میں تجھ کو اب بھی یاد آتا ہوں؟

نہ بھولوں گا کبھی وہ چند گھڑیوں کی ملاقاتیں
ابھی تک یاد ہیں مجھ کو وہ تیری پیار کی باتیں

گھٹا جاتا ہے دم فرقت میں کچھ کھویا سا جاتا ہوں
میں اپنی بے بسی پر غم رسیدوں کو رلاتا ہوں

نکل آتے ہیں آنسو جب کوئی کچھ پوچھ لیتا ہے
مجسم کر کے اپنی آرزوئیں یوں دکھاتا ہوں

کیا ہے سوز نے دل کو مرصع داغ حسرت سے
ترے آنسو کی قیمت اپنے دل میں میں لگاتا ہوں

وہ آنسو جو دم رخصت ترے رخسار پر آیا
اسی کی یاد میں آنکھوں سے خون دل بہاتا ہوں

وہ تیری حسرت و ارماں کا آنسو بن کے بہہ جانا
وہ میرے آنسوؤں کا جذب ہو کر دل میں رہ جانا

ایک منظوم خط

اے مرے دوست اے مرے پیارے
اے سپہر امید کے تارے!

اے محبت کے گلشن شاداب
میری جانب سے عرض ہے آداب

ہے گزارش مری یہ بعد سلام
ہجر نے کر دیا ہے کام تمام

زندگی اپنی ہو گئی بے سود
گم ہوئی میری منزل مقصود

دل پہ چلتے ہیں شوق کے آرے
رنج ہیں ایک جان پر سارے

ضبط کی تاب اب ذرا بھی نہیں
ٹھیرتا ہی نہیں ہے قلب حزیں

جلوہ اپنا اگر دکھاتا تھا
دل کو میرے جو آزماتا تھا

سنتے کچھ تو مری کہانی بھی
کچھ تو لازم تھی مہربانی بھی

کیا کروں تم کو کچھ خبر ہی نہیں
عشق میں کوئی جل رہا ہے کہیں

ایک مدت سے رو رہا ہے کوئی
منہ کو اشکوں سے دھو رہا ہے کوئی

آنکھیں دیدار کو ترستی ہیں — رات دن حسرتیں برستی ہیں
تم کو فرصت نہیں ہے آنے کی — مجھ میں ہمت نہیں ہے جانے کی
کیا ہو تدبیر تم سے ملنے کی — غنچۂ آرزو کے کھلنے کی
اف خبر میری جلد لو پیارے — جان جاتی ہے رنج کے مارے

دل غمگیں تمہیں دعا دے گا
تم کو اس کی جزا خدا دے گا

ایک بڑھیا کا عشق ایک نوجوان سے

(از نجالا)

ستم مجھ پہ کیا تو نے ظالم کیا ہے — نہ مرنے دیا ہے نہ جینے دیا ہے
نہ آنکھوں پہ ہے اپنا قابو نہ دل پر — محبت نے تیری یہ کیا کر دیا ہے
لگائی ہے مہندی سنواری ہے چوٹی — بہت تیل پانی کا مانجھا کیا ہے
یہ سرخی یہ پوڈر یہ مانگ اور پٹی — ترے واسطے میں نے سب کچھ کیا ہے
نہ ہے دانت منھ میں نہ ہے پیٹ میں آنت — ترے عشق نے مجھ کو اندھا کیا ہے
اندھیرے میں کیوں ہاتھ تجھ پر نہ پھیروں — مری اجڑی کٹیا کا تو ہی دیا ہے
مرے پاس کیا ہے کہ صدقے کروں میں — جو پہلو میں دل تھا تجھے دے دیا ہے
جوانوں سے بڑھ کر میں خدمت کرونگی — تو سرتاج پیتم ہے موہن پیا ہے
کھلاؤں گی گودی میں میں تجھ کو بالم — تو آنکھوں کا تارا ہے من کی ضیا ہے
میں کہہ کہہ کے تھک جاتی ہوں حال اپنا — مگر تو نے ہونٹوں کو اپنے سیا ہے
ضعیفی پہ میری ترس کھا خدارا — بڑھاپے میں دل میں نے تجھ کو دیا ہے
نہ دل توڑ بڑھیا کا اے میرے ساجن — اسی مضطرب دل میں تیرا ٹھیا ہے

مجھے کیا: کوئی جا کے دنیا سے کہہ دے
کہ بڑھیا نے دل اک جواں کو دیا ہے

آرزوئے موہوم

کاش اک دن بزم میں تم میری آ کر بیٹھتے
اور نقاب عارض تاباں اٹھا کر بیٹھتے

پاس آتے بے خطر پہلو ملا کر بیٹھتے
پھر تو ہم تم ہوتے اور سب کچھ بھلا کر بیٹھتے

لڑکھڑاتے جھومتے گرتے لجا کر بیٹھتے
دیکھ کر نزدیک مجھ کو مسکرا کر بیٹھتے

کیا خبر ہوتی رقیبوں کو ہمارے ربط کی
دیدۂ گردوں سے بھی نظریں بچا کر بیٹھتے

آسمان پیر کی نظروں سے بچنے کے لئے
بانوئے مہتاب کے آنچل میں جا کر بیٹھتے

بے خبر ہوتا ہمارے راز سے مرغ چمن
نخل گل کے سایہ میں ہم چھپ چھپا کر بیٹھتے

جاں فزا وجد آفریں ہوتی ہماری زندگی
رنگ گل میں بوئے نسریں میں سما کر بیٹھتے

ناصح مشفق ہماری گرد پا سکتا نہ تھا
بادلوں کی اوٹ میں ہم دونوں جا کر بیٹھتے

پھر اگر کچھ خوف ہوتا گردش افلاک کا
ماورائے سرحد افلاک جا کر بیٹھتے

ہم نہ کچھ بھی جانتے جز معنیٔ عیش و سرور
لوح فطرت سے خط کلفت مٹا کر بیٹھتے

آہ! یہ کالی گھٹا اور کشتیٔ عمر رواں
کاش تم بھی ساتھ ہوتے پاس آ کر بیٹھتے

دور کافی دور جاتے ساحل آلام سے
کھیلتے موجوں سے اور سب کچھ بھلا کر بیٹھتے

ہم منا لیتے تمہیں تم پاس آتے تو سہی
روٹھ کر آتے یہاں اور مسکرا کر بیٹھتے

نامساعد تھی اگر ویرانۂ دل کی فضا
میری محروم جمال آنکھوں میں آ کر بیٹھتے

تم اگر دل گیر ہوتے شوخیٔ گفتار سے
حشر ہو جاتا مگر تم کو منا کر بیٹھتے

حسرت و اندوہ کے ظلمت کدے سے دور تر
اپنی خلوت میں چراغ دل جلا کر بیٹھتے

عافیت گاہ مشیت کے حریم ناز میں
شحنۂ تقدیر سے دامن چھڑا کر بیٹھتے

عبرت آباد حوادث ہے جہان آب و گل
اس جہاں سے دور اک دنیا بسا کر بیٹھتے

دل ہی بیٹھا جا رہا تھا رکھ معاف اے ہم سفر ورنہ ہم اور سایۂ دیوار پا کر بیٹھتے
دل پہ واصف کے جو ہو جاتی نگاہ التفات
اس جہنم کو بھی ہم جنت بنا کر بیٹھتے

خیر باشد

دریائے غم کی موجوں میں کھونے چلا ہے دل پھر اپنے ساتھ ہم کو ڈبونے چلا ہے دل
دہرائی جا رہی ہیں روایات درد عشق پھر حسن پر فریفتہ ہونے چلا ہے دل
آرائش جمال کا اللہ رے اہتمام تار نظر میں اشک پرونے چلا ہے دل
دامن میں لاکھ جوشش طوفاں لیے ہوئے قرباں خرام ناز پہ ہونے چلا ہے دل
پھر ہیں تصورات کی رنگینیاں وہی رانیں لہو سے اپنے بھگونے چلا ہے دل
یارب مرے جہان تمنا کی خیر ہو آنکھوں سے شرط باندھ کے رونے چلا ہے دل
چہرہ اداس دل میں خلش لب پہ آہ ہے
رخصت بخیر! دل پہ کسی کی نگاہ ہے

ایک حسرت

تو اگر آئے تو اک بار بلاؤں تجھ کو قصۂ طول شب ہجر سناؤں تجھ کو
عہد ماضی کا سماں یاد دلاؤں تجھ کو دل کے مٹتے ہوئے آثار دکھاؤں تجھ کو
اب کہاں شور وہ چڑھتے ہوئے طوفانوں کا
اب سفر ختم ہے نپٹتے ہوئے میدانوں کا
تھی مسرت کی کبھی حسرت بیجا دل میں تھی کبھی دشت نوردی کی تمنا دل میں
تھا کبھی وصل کی تدبیر کا نقشہ دل میں آہ! کیا دن تھے کہ تھا پیار سے بھی کیا کیا دل میں
یاد باقی ہے چھلکتے ہوئے پیمانوں کی
یہ ہے نعمت مرے بیتے ہوئے افسانوں کی

ہاں کبھی گلشنِ امید تھا میرا شاداب   ہاں کبھی میرے لئے تو نے اٹھایا تھا نقاب
دل میں آیا نہ کبھی واہمۂ روزِ حساب   عیش و عشرت میں ہی رخصت ہوئے ایامِ شباب
آج وہ دل ہی نہیں ہنس کے ہنسانے والا
جھوم کر چرخ کی بنیاد ہلانے والا

کیف باقی نہیں اب خونِ جگر پینے میں   اب نہ مرنے میں تکلف نہ مزا جینے میں
تودۂ خاک ہے اب قلب نہیں سینے میں   ڈوب کر رہ گئے جلوے اسی آئینے میں
چھیڑنے سازِ نفس کو جو صبا آتی ہے
دور سے کانوں میں آوازِ درا آتی ہے

یاد ہے مجھ کو تری طلعتِ موزوں کا نکھار   ہائے وہ شوخ ادائیں وہ جوانی وہ ابھار
آنکھ وہ آنکھ فرشتوں کو کرے جو بیمار   چال وہ چال قدم اٹھتے ہی آجائے بہار
تھی تمنا تری تعریف سناؤں تجھ کو
تیری ہنستی ہوئی تصویر دکھاؤں تجھ کو

قبل اس کے کہ ہر اک شے سے کنارا کرلوں   راہ دشوار ہے کچھ دل کا سہارا کرلوں
تلخیٔ زیست بھی کچھ دیر گوارا کرلوں   دو گھڑی اور تہِ چرخ گزارا کرلوں
آ، کہ آنکھوں سے کوئی گیت سنا دوں تجھ کو
ایک اجڑتا ہوا فردوس دکھادوں تجھ کو

سیاسی نظمیں

آل پارٹیز کانفرنس

۱۹۲۸ء

دل کہ جو تھا غیرت برق طپاں جاتا رہا　　جذبۂ سرگرم کاری کا نشاں جاتا رہا
مقصد آزادئ ہندوستاں جاتا رہا　　رنگ حریت جو رخ پر تھا عیاں جاتا رہا
آہ! ذوق ہم نوائی کچھ بھی کام آیا نہیں
کان میں کچھ کامیابی کا پیام آیا نہیں

تجھ میں اے ہندوستاں ناکامیاں آباد ہیں　　آرزوئیں بھی تری محکوم استبداد ہیں
اف! ترے جذبات اسیر پنجۂ بیداد ہیں　　اے دیار ہند! کیا اگلے زمانے یاد ہیں
ہے نزاع باہمی کی حامل اک کثرت تری
اکثریت کا نشانہ ہے اقلیت تری

آہ! امید تلطف اک خیال خام تھا　　لاف ہمدردی احباب وطن اک دام تھا
مجرم افسردہ کاری نیز ایہ انجام تھا　　انفعال اپنی روش پر زینت الزام تھا
چاہیئے بالکل نہیں یاران محفل کا گلہ
اب تو لازم ہے کہ کیجے دل سے ہی دل کا گلہ

جنگ آزادی

۱۹۳۰ء

مسلم ہندی! اگر ہے تجھ کو آزادی کی قدر
آگیا وقت عمل سن لے مرے پیغام کو
تجھ کو کچھ اسلاف کی خودداریاں بھی یاد ہیں؟
آج تک جن کی حمیت پر ہے فخر اسلام کو
دے چکا ہے درس آزادی تجھے شاہ عرب
اٹھ کے تو بھی آج روشن کر بڑوں کے نام کو

لاج تیری عظمت پیشیں کی تیرے دم سے ہے
یاد کر! تیرا تعلق ملت محکم سے ہے

امتحاں منظور ہے صبر و تحمل کا ترے
مرحبا کہہ اپنے صیادوں کے لطف عام کو
جان دینا ملک و ملت پر ہے پیغام حیات
سرفروشی سے ملی ہے زندگی اقوام کو
اے مسلماں تجھ کو اب کم ہمتی زیبا نہیں
ناز ہے جرأت پہ تیری مادر ایام کو

جنگ آزادی میں مٹ جا زندگی مل جائے گی
تیری موج خوں سے بنیاد زمیں ہل جائے گی

عبرت

۱۹۳۱ء

(تضمین بر نظم جناب ہلال احمد صاحب زبیری ایم۔ اے۔ ایڈیٹر اخبار الجمعیۃ دہلی)

جبکہ جولاں اتحاد قوم کا شبدیز ہے
ان کی جانب سے نفاق و حقد کو مہمیز ہے
ہائے اپنوں کی کہانی کیا ہی درد آمیز ہے
اجنبی سے میل ہے بھائی پہ خنجر تیز ہے

آہ! ان کی جو ادا ہے افتراق انگیز ہے

دوستوں کے عیب دنیا بھر کو دکھلاتے ہیں وہ
دشمنوں کی ہر ادا پر خوش ہوئے جاتے ہیں وہ
فتنہ سامانی کے دلدادہ نظر آتے ہیں وہ
صلح کی جو گفتگو ہو اس سے گھبراتے ہیں وہ

ان کو گویا اتحاد قوم سے پرہیز ہے

اپنی قربانی مٹانے کے لئے آمادہ ہیں آبرو اپنی لٹانے کے لئے آمادہ ہیں
دوست دشمن کو بنانے لئے آمادہ ہیں دیمیزے کے پاس جانے کے لئے آمادہ ہیں
معتمد ان کا جو کوئی ہے تو وہ انگریز ہے

دوستی کی ہے توقع ان کو اس غدار سے جاں بلب جس کے مظالم سے مسلماں ہو گئے
وائے نادانی کہ ہیں نیار لندن کے لئے وائے ناکامی کہ اپنا دوست سمجھے ہیں اسے
جو فلسطین و عراق و مصر میں خونریز ہے

ہو رہا ہے جس کی غداری کا کب سے امتحاں آہ! لوٹی جس نے شان و شوکت اسلامیاں
عہد میں جس کے، بنے دشمن زمین و آسماں جس کے ہاتھوں زندگی سے تنگ ہے ہندوستاں
جس کا ہر اعلان ہر دعویٰ فریب آمیز ہے

تہنیت سفارت امریکہ

بجناب آنریبل سید آصف علی صاحب دہلوی

سنہ ۱۹۴۷ء

صبا کے دوش نازک پر پیام باوری آیا نئے انداز سے ساقی بشان دلبری آیا
علی الرغم ستم کیشئ چرخ چنبری آیا بکف ساغر بصد عشوہ پئے چارہ گری آیا
وطن میں آج پھر اک قوم کی تعمیر ہوتی ہے
پلا ساقی کہ پھر کچھ مہرباں تقدیر ہوتی ہے

خوشا ساعت کہ آئین جہاں تبدیل ہوتا ہے مزاج دلبر نامہرباں تبدیل ہوتا ہے
نظام کشور ہندوستاں تبدیل ہوتا ہے سنا ہے آج طرز آسماں تبدیل ہوتا ہے
ادھر آ جلد نذر کر لیں جہان تازہ تر پیدا
نہ کرے پھر بہانہ کوئی چرخ فتنہ گر پیدا

ادھر آ ساقی مہوش کہ پھر دور شراب آیا مبارک ہو کہ پھر اقوام مشرق پر شباب آیا

نوید حریت لے کر افق پر آفتاب آیا — حذر اے گردش دوراں کہ عہد انقلاب آیا

زہے قسمت کہ اب ہندوستاں آزاد ہوتا ہے

یہ دلی آہ! یہ اجڑا چمن آباد ہوتا ہے

ستارہ ہند کا اب مطلع عالم پہ چمکا ہے — سفیر ہند امریکا کی جانب راہ پیما ہے

جہان آباد کو تقدیر نے یہ فخر بخشا ہے — کہ یہ ویرانہ اب پھر رشک افلاک ہوتا ہے

سفیر ہند کا عہدہ جو زیر انتخاب آیا

تو یہ قرعہ بنام آصف عالی جناب آیا

غلامی ہند کی دوبھر ہوئی اقوام عالم پر — یہ جنت اف یہ جنت تنگ ہے اولاد آدم پر

لگی ہے آس دنیا کی تمھاری سعی پیہم پر — نگاہیں اٹھ رہی ہیں اب تمھارے عزم محکم پر

بجز چشم تمنا دل شکستوں کی صدا کیا ہے

تہی دستوں کا سرمایہ بجز دست دعا کیا ہے

ہمیں بھی یاد آئیں گے تمھارے کیف زا جلوے — تمھیں بھی یاد آئیں گے یہ دلی کے گلی کوچے

چہ نزدیکی چہ دوری چوں شود دل را بدل راہے — خدا ہر مرحلے سے تم کو شاد و کامراں لائے

بجز اشک مسرت کیا ہے اپنی شوق سامانی

دعا گوئے حضورت زار شد از چاک دامانی

مبارک ہو رہ ملت میں تم کو گامزن ہونا — وطن سے دور رہ کر خادم ملک و وطن ہونا

بکف شمشیر و در دل خوف رب ذوالمنن ہونا — بصد عظمت بصد اجلال زیب انجمن ہونا

باعزاز سفیر خوش گہر اک جام دے ساقی

کہاں و آصف کہاں کلفت خدا کا نام لے ساقی

نظمیں

علاحدہ

پیشکش نیاز

بہ خاک پائے مہر ضیائے بندگان اعلیٰ حضرت قدر قدرت سلیمان فر آصف جاہ نظام الملک والملت شہریار اولوالعزم سلطان العلوم ہزاگزالٹڈ ہائینس میر عثمان علی خاں بہادر تاجدار دولت علیۂ دکن خلد اللہ ملکہ (بہ تقریب تشریف آوری از حیدر آباد دکن بدیار جہان آباد)

سنہ ۱۹۲۸ء

حیرت فزا ہے ہر در و دیوار کی فضا
نظارہ دوز کوچہ و بازار کی فضا

معمور حسن عرصۂ گلزار کی فضا
دل کش ہے کائنات کے افطار کی فضا

ذرات ارض غرق ہیں دریائے نور میں
چشمے ابل رہے ہیں طرب کے سرور میں

مصروف عجز خاک سر رہگذر ہے آج
حیران و مست وجد میں ہر بام و در ہے آج

بزم جہاں میں عیش و طرب کا اثر ہے آج
دل چاہتا تھا جس کو وہ پیش نظر ہے آج

آتی ہے ہر طرف سے صدائے خوش آمدید
ہاتف ہر اک کو غیب سے دیتا ہے اک نوید

چاروں طرف سے آتی ہے آواز مرحبا
اک شور تہنیت کا ہے ہر سو مچا ہوا

آتی ہے سب کے کانوں میں یہ غیب سے ندا
طُوبیٰ لکُم سعادتکم ایّہا الوریٰ

افسردہ دل میں ایک جھلک ہے امید کی
کیا آرہی ہے آج گھڑی جشن عید کی

ناگاہ نغمہ ریز طرب ساز ہو گئے — ظاہر نشاط و کیف کے سب راز ہو گئے
پیدا زمیں پہ فخر کے انداز ہو گئے — افلاک سیر نجم سے گلباز ہو گئے

دل نے کہا کہ آمد شاہ نجوم ہے
مہر سمائے لطف و کرم کا قدوم ہے

وہ جس کے فیض وجود کا دریا رواں ہوا — سیراب جس سے گلشن ہندوستاں ہوا
آغوش دہر سے جو یگانہ عیاں ہوا — دلی میں کیسی دھوم سے وہ میہماں ہوا

رضوان خلد علم و فضیلت شہ دکن
خورشید آسمان جلالت شہ دکن

سدرہ نشین شوکت و سطوت حسام ملک — قائم ہے جس کی ذات سے نظم و نظام ملک
ظل خدا و مرجع ہر خاص و عام ملک — برتر خصال و قدوۂ عالی مقام ملک

رعب و جلال و کر شہی کا مجسمہ
مصداق عزم و فر شہی کا مجسمہ

اے کوہ استقامت و اے آسمان علم — پنہاں تری نمود میں ہے اک جہان علم
سلطان علم و صاحب فضل دروان علم — دارائے عدل حامی دیں پاسبان علم

بنیاد خلق و مجد و نجابت سحاب جود
تعمیر قصر مفخر خلق و مآب جود

اے یادگار ملت بیضا بنائے قوم — اے اصل جود دم سے ترے ارتقائے قوم
تیری حمایتوں پہ ہے حصر بقائے قوم — مانے ہوئے ہے ہند تجھے پیشوائے قوم

ذرے میں نور ہے تو ہے پرتو سے مہر کے
روشن ہیں سب نجوم تجھی سے سپہر کے

رونق فروز قصر فلک شاں ہے تیری ذات
آمد سے تیری مست ہوئی بزم کائنات

تیرا قدوم گنز طرب مایہ حیات
عرض نیاز خامہ ہے تسطیر تہنیات

گلہائے آرزو بفشانم بہ پائے تو
جانم نثار و چشم و دل من فدائے تو

دلی جو ملک ہند کا اجڑا دیار ہے
اک کاروان رفتہ کی رہ کا غبار ہے

افسانہ اس کے عہد کا اس کا مزار ہے
کیف شراب دوش کا گویا خمار ہے

جلوہ گری سے تیری پھر آباد ہو گیا
زینت فزائے گلشن ایجاد ہو گیا

کلکم چوں بلبل چمن گلشن حجاز
نغمات مدح شاہ سراید بصد نیاز

دست نوال و بذل دو رویہ شدہ دراز
لطفش بہر نشیب و عطایش بہر فراز

داعی عرب بدولت عثماں علی جلال
داعی عجم بشاہ ہمایون و نیک فال

اے تاجدار سلطنت آمن و سعید
اے مرجع امانی و ملجائے ہر امید

راز عنایت تو بہ عالم شدہ پدید
قفل تر حدات جہاں را توئی کلید

اے شرح راز عیش و مسرت تکلمت
صبح امید بر افق دل تبسمت

قائم یہ تیری شوکت و حشمت رہے مدام
اقبال و جاہ و عظمت و صولت رہے مدام

عالم کو تیرے فیض سے راحت رہے مدام
حاتم سے بڑھ کے تیری سخاوت رہے مدام

آغاز از ثنا بود و انجام بر دعا
واصف ازیں دو بحر نہ گردید آشنا

شکریۂ طبع اول کتاب درس الاسلام

بزرگوں کا تصرف درس الاسلام
جب اس کا پہلا حصہ ہو گیا تمام

ہوئی فکر طباعت دل پہ طاری
کہ ہو جائے یہ محنت نیک فرجام

تمنا تھی کہ شائع جلد ہو جائے
مگر بے زر بنے کیونکر کوئی کام

نوا سنجی ہے رہین بے نوائی
یہاں کچھ ہے تو بس اللہ کا نام

قلندر بھی ہے قدرت کی نشانی
اگر اس کا غم الفت نہ ہو خام

کہاں عادت تھی عرض مدعا کی
مگر تھا چونکہ یہ اک دین کا کام

بصد جرأت کیا اظہار مقصد
ارادہ تھا کہوں احباب سے وام

عجب خوف و رجا میں مبتلا تھا
کہ گردش میں یہ کیونکر آئے گا جام

یکایک خود ہی اک مرد دلاور
بڑھا آگے بصد اعزاز و اکرام

وہ مرد با خدا فرخندہ سیرت
ہے محبوب خواص و مرجع عام

شرف ہے فن طب میں اس کو حاصل
کہ ہے مشغول خدمت صبح تا شام

کرم گستر جو پہلے سے ہے مجھ پر
ہوئے ہیں سیکڑوں احسان و انعام

کریم ابن کریم و صاحب فیض
شریف الدین بغائی جن کا ہے نام

کہا مجھ سے کہ مایوسی بری ہے
نہ گھبراؤ کہ ہو جائے گا سب کام

غرض شائع ہوا یہ پہلا حصہ
دیئے موصوف نے لاگت کے سب دام

جزائے خیر دے باری تعالیٰ
بڑھے دارین میں اعزاز و اکرام

قبول عام پائے ان کا ایثار
اٹھائیں فائدہ اطفال اسلام

سخن کیا اور کیا واصف کی پونجی
بجز حرف دعا، وَاللّٰہُ مِنۡہُ اَمَ

قطعہ تہنیت

بخدمت جناب میر مشتاق احمد صاحب زید مجدکم صدر دلی پردیش کانگریس کمیٹی

السلام علیکم - دلّی کی میٹروپولیٹن کونسل کے چیف اگزیکٹو کونسلر منتخب کیے جانے پر واصف ناکارہ کی طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمائیے ۔ ۶ ر ستمبر ۱۹۶۶ء

بڑے خوش نصیبوں میں ہیں میر صاحب
خدا نے دیئے ان کو اعلیٰ مراتب

ہمیشہ سے خدمت کے خوگر رہے ہیں
کئی مجلسوں کے بھی ممبر رہے ہیں

دل درد مند ان کو حق نے دیا ہے
بڑا حوصلہ ہے بڑا دبدبہ ہے

غریبوں کے ساتھی رہے ہیں ہمیشہ
فداکار ہیں اور ایثار پیشہ

وہی آج بھی صدر ہیں کانگریس کے
ستاروں میں وہ بدر ہیں کانگریس کے

معزز ہیں پہلے سے اور با اثر بھی
بنے چیف اگزیکٹو کونسلر بھی

یہ قدرت کا خاص ان پہ لطف و کرم ہے
ترقی پہ ہر روز ان کا بھرم ہے

مبارک ہو یہ عزو اقبال و دولت
ہمیشہ مضاعف رہے جاہ و رفعت

ثنا کیوں نہ نکلے زبان قلم سے
کہ دلّی کی عزت بڑھی ان کے دم سے

شرف مجھ کو حاصل ہے ہمسائگی کا
مگر پردہ حائل ہے بے مائگی کا

عقیدت کا اظہار سب نے کیا ہے
مرا تحفہ بس ایک حرف دعا ہے

مرثیے

یادِ اجمل

(بر وفات مسیح الملک حکیم اجمل خاں دہلوی۔ المتوفی ۲۸ر دسمبر ۱۹۲۶ء
مطابق ۱۳۴۶ھ در رامپور)

زمینِ ہند پر برپا قیامت خیز طوفاں ہے — لبوں پر نالہ و شیون دلوں میں سوزِ ہجراں ہے
اسیرِ درد کی قسمت پہ ناکامی بھی خنداں ہے — یہ صورت دیکھ کر دیدہ سیہ بختوں کا گریاں ہے

صدائے دردِ غم بگرفتہ مشرق را ز مغرب را
کہ ماوائے نماندہ مجد و فضل و حکمت و طب را

مسیح الملک جو سدرہ نشیں عزم و ہمت تھا — سحاب فیض کوہ استقامت بحرِ حکمت تھا
وہ اجمل جو فروغ افزائے بزم دین و ملت تھا — مسلم رہبر اعظم، مسلمانوں کی قسمت تھا

نگاہیں ڈھونڈھتی ہیں اس نوا سنجِ صداقت کو
ترستا ہے دلِ بیتاب اب عیش و مسرت کو

وہ اجمل آہ! جو زینت دہ ایوانِ امکاں تھا — شرافت کے سما کے آسماں کا مہرِ تاباں تھا
وہ جس کے فیض سے دلی کا خطہ اک خیاباں تھا — جدا ہم سے ہوا فردوس دہلی کا جو رضواں تھا

پیاپے آرہی ہے یہ صدا شہرِ خموشاں سے
جو قابل ناز کے تھی لٹ گئی رونق گلستاں سے

وہ اجمل آہ جو کل تک رئیس بزمِ خلاں تھا — چراغِ زندگانی آہ کل جس کا فروزاں تھا
ہوا وہ آج رخصت جس پہ سارا ہند نازاں تھا — ہمارا ہم نوا غم خوار دردِ دل کا درماں تھا

نقاب خاک میں پنہاں فلک نے کر دیا اس کو
وطن سے دور جا کر موت کا ساغر دیا اس کو

جو کل تک جلوہ آرا تھا سپہر علم و عرفاں پر
کرم کی ضو فشانی کر رہا تھا چرخ احساں پر
برابر کار فرما تھا ہمارے جسم اور جاں پر
ترنم ریزیاں جو کر رہا تھا بزم امکاں پر

فلک کے جور بے جا نے کیا نذر فنا اس کو
چھپایا زیر خاک اس کو کیا ہم سے جدا اس کو

کہاں ہو آہ! اے اجمل نگاہیں تم کو جویا ہیں
تمہاری یاد میں مضطر تمہارے نام لیوا ہیں
در و دیوار سے آثار ویرانی ہویدا ہیں
تسلی دو ہمیں آ کر کہ ہم ماتم سراپا ہیں

سراسر خوں شدہ ارماں زچشم خونفشاں ریزد
بیادت خوش بگریم خوں زہر و فلکم تغاں ریزد

دعا ہے کہ اب جولانگاہ اجمل خلد اعلیٰ ہو
دعا ہے اب کہ اجمل نغمہ سنج شاخ طوبیٰ ہو
بروز حشر زیر سایۂ عرش معلےٰ ہو
شہنشاہ عرب کا قرب شامل لطف مولیٰ ہو

گہرہائے سرشکم می فشانم بر مزار تو
بداراے دو عالم می سپارم جملہ کار تو

بستر مرگ سے آخری پیغام

دولہیۂ مولانا نور الدین بہاری اسیر فرنگ کا اپنے شوہر کے نام ۔ سنہ ۱۹۳۲ء

اے وجہ سکون دل اے راز ضمیم دل
اے مالک ملک دل اے شاہ حریم دل
لو جاتی ہوں دنیا سے کچھ نیند سی آتی ہے
مدت کی رفاقت کو اب موت چھڑاتی ہے
یہ وقت جدائی بھی کیا درد فزا آیا
تم جیل میں ہو مجھ کو پیغام قضا آیا
دکھتا ہوا دل لے کر جب جیل سے آؤ گے
اس عالم خاکی میں تم مجھ کو نہ پاؤ گے
آہوں کا تلاطم ہو اور ہو شب تنہائی
چھوٹے نہ کبھی لیکن دامان شکیبائی
ایثار و وفا جوہر ہے اہل شجاعت کا
تسلیم و رضا شیوہ ہے صاحب الفت کا

محمود ارادوں میں اک پاک عزیمت میں — چھوڑا ہے تمھیں میں نے قربانگہ ملت میں

خاتون کی رحلت ہے شوہر کی اسارت ہے
مرحومہ کو جنت کی واصف یہ ضمانت ہے

تأثراتِ غم

بر رحلت ہمشیرہ عزیزہ زبیدہ خاتون

متوفیہ ۱۹ر شعبان ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۲ر ستمبر ۱۹۴۱ء بعمر ۱۸ سال

گئی داغ جدائی دے کے سوئے روضۂ جنت — زبیدہ پیکر عفت جواں سال و جواں ہمت
مزین زیور علم و ہنر سے خلق و تقویٰ سے — پسندیدہ خصائل نیک سیرت موہنی صورت
سکونِ قلب مادر نور چشم مفتیٔ اعظم — اور اپنے بھائیوں بہنوں میں تھی اک مرکزِ الفت

نہاں ماں باپ کے سینوں میں تھیں کیا کیا تمنائیں
کہ ہاتف نے کہا واصف زبیدہ ہوگئی رخصت

اہلیہ مرحومہ کی یاد میں

(متوفیہ ۱۸ر جولائی ۱۹۴۵ء)

یہ ہیں کبریائی کی طرفہ ادائیں — ادھر بے نیازی ادھر التجائیں
مشیت مسلم قوانین محکم — تدابیر بیسود ردّ ہیں دعائیں
بڑی آرزوؤں سے جو گھر بنا تھا — ہلا ڈالیں قسمت نے اس کی بنائیں
یہ جانِ حزیں اور ایسے مصائب — یہ تھوڑی سی عمر اور اتنی بلائیں
یہ کیا زندگی ہے یہ کیا بے کسی ہے — مقدر مخالف، مکدر فضائیں
مرے طاقِ دل کا دیا بجھ گیا ہے — اب اس تیرہ محفل میں ارمان آئیں
ذرا سن نوائے عازمِ بزمِ افلاک — مرے نالۂ نیم شب کی صدائیں
برستی ہے حسرت ترستی ہیں آنکھیں — کہاں تجھ کو ڈھونڈھیں کہاں تجھ کو پائیں

سکوں آفریں تھی تری چشم الفت — کہاں قلب مضطر کو اب لے کے جائیں
کہاں گھر کہ جس کو کہا جائے ویراں — کہاں دل کہ جس کی کہانی سنائیں
یہ فصل بہار اور ساون کے چھینٹے — نہ راس آئیں تجھ کو یہ رنگیں فضائیں
یہ معصوم بچے یہ اندوہ حرماں — اداسی، تحیر، تجسس، ندائیں
دلوں میں ہیں خوں گشتہ ارماں ہزاروں — نگاہوں میں لاکھوں خموش التجائیں
یہاں ہم ہیں اور تند باد حوادث — وہاں تم ہو اور جنتوں کی ہوائیں
گزرتی ہیں آنکھوں میں فرقت کی راتیں — بس اک میں ہوں اور ہیں غم افزا نوائیں
تڑپتے ہیں ارماں دل مضطر آہیں — جگر چیر کر آہ! کس کو دکھائیں
سنا ہے کہ ہے عید بھی آنے والی — ہمیں کیا جو عیدیں ہزار ایسی آئیں
مٹے گا نہ دل سے یہ داغ جدائی — رہیں گی مجھے یاد تیری وفائیں
میسر تجھے خلد میں رزق و نعمت — مبارک ہوں پیہم عطائیں رضائیں
کریں روح کو تیری سرشار و سیراب — ترے رب کے لطف و کرم کی گھٹائیں

ترے فضل و احساں کا طالب ہے واصف
ہیں وابستہ یا رب تجھی سے رجائیں

خانہ بربادی

اک نخل تمنا تھا اس گلشن فطرت میں — اس نخل تمنا پر اک طرفہ نشیمن تھا
کیا وہ نشیمن تھا آباد تعالی اللہ — راحت کدۂ دل تھا ارمانوں کا مخزن تھا
معمور فضائیں تھیں انوار مسرت سے — ہر گوشہ نشیمن کا اک وادیٔ ایمن تھا
ہر ذرہ منور تھا معمورۂ ہستی کا — نیرنگیٔ عالم کا ہر نقش مزین تھا
مخمور ہوائیں تھیں صہبائے محبت سے — اندیشۂ فردا سے فارغ وہ نشیمن تھا
ناگاہ بھڑک اٹھی وہ آگ جو مضمر تھی — یک لخت گلستاں کا ہر غنچہ فلاخن تھا

طوفان حوادث نے تاراج کیا اس کو
جب آنکھ کھلی دیکھا تا حد نظر بن تھا

کس دل سے کہوں ہمدم کل جس پہ گری بجلی
وہ تودۂ خاکستر میرا ہی نشیمن تھا

وارفتگیٔ حرماں لائی ہے کہاں مجھ کو
اب ڈھونڈھ رہا ہوں میں کس سمت وہ گلشن تھا

ہر سمت اداسی ہے ویرانی ہے حسرت ہے
جب دل تھا جواں اپنا دنیا پہ بھی جوبن تھا

استاد مرحوم نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی کی یاد میں

المتوفی ۱۵ ستمبر ۱۹۴۵ء مطابق ۷ شوال ۱۳۶۴ھ

کیوں یکایک اہل محفل پر اداسی چھا گئی
ہمدمو! دل تھام لو وہ آصف کی باری آگئی

آج سائل، آہ سائل، کیا ہوا کس نے کہا؟
کوچہ و بازار میں کیسا ہے محشر سا بپا

کیا سناؤں تم کو اپنے درد و غم کی داستاں
کیا دکھاؤں تم اپنے دل کی چوٹوں کے نشاں

ختم ہیں آنسو مگر مجھ کو قرار آتا نہیں
زخم بھر جاتے تو ہیں لیکن نشاں جاتا نہیں

حسرت آگیں ہے کہانی شاعر مظلوم کی
مٹ گئی خاص اک نشانی دہلیٔ مرحوم کی

دل کہ جو ہے صد ہزار اسرار فطرت کا امیں
آج لیکن ضبط غم کی تاب لا سکتا نہیں

یاد اجمل خاں تھی اب تک جاں گسل واحسرتا
آج صرف ماتم سائل ہے دل واحسرتا

ٹھیر جا دم بھر دل بیتاب رونے دے مجھے
مرقد سائل پہ گوہر بار ہونے دے مجھے

اے کہ تجھ سے گلستان مکرمت شاداب تھا
تو کتاب عظمت اسلاف کا اک باب تھا

اے کہ تھی تیری نگاہوں میں قیامت کی کشش
دل کی گہرائی سے ہوتی تھی محبت کی کشش

جادۂ انوار قدسی تھا ترا تار نگاہ
تھی وجاہت تیری اک تمثیل تخلیق الٰہ

تیرا خلق و اعتنا تھا در خور صد احترام
دل کا تیری اک نگاہ مہر سے ہوتا تھا کام

محرم اسرار الفت دیدۂ بینا ترا
روئے روشن کی طرح تھا منجلی سینہ ترا

رشک تمکین ابوۃ تیری شان حلم تھی
پر تو شان نبوۃ تیری شان حلم تھی

آشکارا تیرے چہرے پر وقارِ باستاں | تیرے خط و خال میں مسطور گزری داستاں
آستاں تیری سخاؤ مرحمت کی سجدہ گاہ | یادگارِ شوکت دیرینہ تیرا فرو جاہ
شرحِ رازِ نیکی و احساں تکلم تھا ترا | جلوۂ صد صبح فردوسی تبسم تھا ترا
تیرا ہر فرمودہ نکہت بار و لطف انگیز تھا | تیرا اک اک لفظ علم و فن کی دستاویز تھا
جسم ہے موجود اور معدوم جانِ شاعری | مٹ گیا تیرے نہ ہونے سے جہانِ شاعری
وہ سراج الدین تھے دلّی کے شمعِ انجمن | ایک شاہِ ہند تھا[1] اور اک شہنشاہِ سخن
ختم اُس پر آلِ بابر کی مہابت ہو گئی | ختم تجھ پر ذوق و فردوسی کی عظمت ہو گئی
اک ظفر کیا لٹ گیا مغلوں کی صولت لٹ گئی | ایک سائل کیا اٹھا دلّی کی دولت لٹ گئی
کون اب ہم کو نکاتِ فن بتانے آئے گا | کون اب سوئے کتب خانہ کرم فرمائے گا
محفلِ دوشیں کی جمعیت پریشاں ہو گئی | رونے والی شمع اک تھی وہ بھی اس کو رو گئی
طاقتِ صبر و تحمل دل سے اب مفقود ہے | چارہ گر جا چارہ فرمائی تری بےسود ہے
کوچۂ رضواں میں جب سائل نے جا کر دی صدا | زمزمہ سنجانِ طوبیٰ نے پکارا مرحبا
مرحبا اے ہم صفیرِ مومنؔ و داغؔ و حزیںؔ | مرحبا اے میہماں جلوہ گاہِ حورِ عیں
ہو مبارک تجھ کو لطف و رحمتِ پروردگار | ہو سلامت تجھ کو باغِ خلد و طرفِ جوئبار

خاکِ مہرولی کہ مہد رفعتِ اسلام ہے
اب وہیں پوشیدہ واصفؔ آفتابِ شام ہے

---

[1] احقر کو دونوں سے انتساب تلمذ کا شرف حاصل ہے۔ حضرت سائل سے توبلاواسطہ شعر و سخن میں تلمذ ہے اور اعلیٰ حضرت ظلِ سبحانی سراج الدین ظفر بہادر شاہ (برد اللہ مضجعہ) سے خوش نویسی میں انتساب ہے۔ احقر نے خطِ نسخ میں استاد عبد الغنی دہلوی ابن منشی ممتاز علی سے اصلاح لی ہے۔ اور منشی ممتاز علی خوش نویسی میں اعلیٰ حضرت ظفر بہادر شاہ کے شاگرد تھے۔ (واصف)

شریکِ زندگی کی یاد

زباں پہ آکے تڑپتی ہے دل کی بات ابھی
لرز رہی ہے نگاہوں میں کائنات ابھی

ستارے گنتے گزرتی ہے ساری رات ابھی
کہ ہوں بلاکشِ خمیازۂ حیات ابھی

ترے خیال سے غافل نہیں نزادِ آصف
نہیں خرابۂ حیرت سے گو نجات ابھی

تری ادائے تغافل کو میں سمجھ نہ سکا
کہ ہوں خرابِ تمنائے التفات ابھی

ادائے ناز ہے یا نیند آگئی تجھ کو
میں کہہ رہا تھا محبت کی واردات ابھی

تڑپ کے ساری خدائی کو کر نہ دے برہم
اٹھا نہ تو دلِ بسمل سے اپنا ہات ابھی

وہ تیرا دستِ حنائی جو یاد آتا ہے
تو میرا دیدۂ گریاں لہو بہاتا ہے

ہجومِ سیلِ مصائب سے دل ہوا تاراج
کہاں ہیں رحمتِ یزداں کی نازنیں امواج

فریبِ خانۂ ہستی سے میں نکل نہ سکا
مقامِ صدق و صفا کی تجھے ہوئی معراج

کہاں وہ رنجشِ الفت کہاں وہ چارہ گری
نہ ہے عنایتِ حرماں کہ درد ہے نہ علاج

وہ اعتدالِ عناصر وہ سوز و ساز نہیں
ترے نہ ہونے سے برہم ہوا چمن کا مزاج

نگاہِ ناز کا تیری حریف تھا جو کبھی
وہ آج تیرِ حوادث کا بن گیا آماج

ببیں بگو نہ عذاب است جانِ آصف را
کہ تند تر شدہ صہبا و نازک است زجاج

سنی ہیں جس نے مرے دل کی دھڑکنیں کل تک
وہ شورِ نالۂ پیہم سے بے خبر ہے آج

دکھا کے ایک جھلک بے نشاں ہو جانا
جگا کے روح کو خود میٹھی نیند سو جانا

یہ آرزوئے مسرت کا انفعال تو دیکھ
بہ ممکنات کے پردے میں اک محال تو دیکھ

کہاں وہ مست خرامی کہاں یہ تیز روی
بیک نگاہ قتیلِ ادا کا حال تو دیکھ

یہ کیا کہا کہ فلک کی یہی ہے رسمِ کہن
جنونِ حشر بداماں کا اشتعال تو دیکھ

فشارِ غم سے کہیں کھل نہ جائے دل کا بھرم — مرے دماغِ تحمل کا اختلال تو دیکھ
شرابِ ناب نہیں پی رہا ہوں خونِ جگر — نشاط داہمۂ جنت خیال تو دیکھ
ہوا زمانہ کہ ہوں مبتلائے رنجِ الم — سرورِ یک نفسِ عمر کا مآل تو دیکھ
قدم اٹھانے کی طاقت نہ تابِ گویائی — اٹھا کے پردۂ محمل کسی کا حال تو دیکھ

یہ جانِ زار پہ کیسا ستم کیا تو نے
نگاہ پھیر کے ناگاہ رم کیا تو نے

ہے تیرے غم میں مری روح بے قرار ابھی — دھڑک رہا ہے دلِ خاکِ رہگذار ابھی
رواں ہے چشمِ تمنا کی جوئبار ابھی — مٹی نہیں ہے محبت کی یادگار ابھی
لحد کی گود میں اس سے صبا یہ کہہ دینا — کہ وا ہے چشمِ تجسس کی بھی کنار ابھی
وفا شعار یہ نکتہ بھلا دیا تو نے — ہے تیرا آصفِ محزوں وفا شعار ابھی
دلِ حزیں کی حسین حسرتوں کا کیا کہنا — ہے داغہائے جدائی سے لالہ زار ابھی
گھری ہوئی ہیں گھٹائیں کھلے ہیں لالہ و گل — چمک رہا ہے یہ اجڑا ہوا دیار ابھی

کبھی دریچۂ جنت سے یہ دیار بھی دیکھ
نقاب الٹ کے یہ اجڑی ہوئی بہار بھی دیکھ

گاندھی جی

(مورخہ ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء روز جمعہ شام کے پانچ بجے ناتھورام گوڈسے
نے گاندھی جی کو ہلاک کیا)

تیرہ خاکِ ہند میں اک شمعِ نورانی تو دیکھ — آسماں اوجِ مقامِ نوعِ انسانی تو دیکھ
تذکرہ ماضی کا تو نے ہم نشیں چھیڑا تو ہے — اب ذرا آصف کے دل کی حشر سامانی تو دیکھ
ناخدا کو اپنے خود ہی غرقِ دریا کر دیا — آہ! اس مخلوقِ دانشور کی نادانی تو دیکھ
اس جہاں میں کیا ملا کرتا ہے نیکی کا صلہ — اس زمیں پر خونِ انسانی کی ارزانی تو دیکھ

فرقہ بندی قتل و غارت رہزنی محسن کشی — یہ سیہ کرتوت اور عزم جہاں بانی تو دیکھ
اے کہ تیرے دم سے تھی جمعیت اجزائے قوم — روٹھنے والے ہماری خانہ ویرانی تو دیکھ
قوم کا سرمایہ تو اور تیری دولت قوم تھی — جانے والے قوم کی بے برگ و سامانی تو دیکھ

بن ترے ویراں نظر آتی ہے مجھ کو خاک ہند
مرنے والے مدتوں روئے گی تجھ کو خاک ہند

اس گنہ کی اب تلافی کوئی کر سکتا نہیں — یہ دل انسانیت کا زخم بھر سکتا نہیں
کس قدر صبر آزما ہے قتل ہو جانا ترا — اب دل مضطر کسی پہلو ٹھہر سکتا نہیں
جان تک قربان کر دی تو نے ہم پر بے دریغ — عمر بھر محسن ترا احساں اتر سکتا نہیں
عام تھی تیری محبت نوع انساں کے لئے — تیری عظمت کو زمانہ محو کر سکتا نہیں
تو نے مر کر امن و آزادی کو زندہ کر دیا — تیرا پیرو شوکت طوفاں سے ڈر سکتا نہیں
مر کے جس کی ہو سو زندہ زیست اوروں کے لئے — یاد رکھ قاتل کہ وہ مر کر بھی مر سکتا نہیں
اس کیاری کو ملا ہے خون اک درویش کا — گلشن الفت کا شیرازہ بکھر سکتا نہیں

چھپ گیا سورج مگر دنیا کو روشن کر گیا
چاند کو اپنی شعاعوں سے مزین کر گیا ۱؎

۱؎ مرحوم پنڈت جواہر لال نہرو

بیاد سلطان دہلوی یکے از تلامذۂ آصف

دل مضطرب ہے اے مرے سلطان ترے بغیر — شیرازۂ خرد ہے پریشاں ترے بغیر
بے لطف سوزش غم ہجراں ترے بغیر — بے کیف داغ دل کا چراغاں ترے بغیر
معدوم ہے سکون دل و جاں ترے بغیر — روٹھی ہوئی ہے عمر گریزاں ترے بغیر
کیونکر علاج سوز غم ہجر کیجئے — صحن چمن ہے اب تو بیاباں ترے بغیر
اب کون کس سے پوچھے گا آکر نکات فن — سنسان ہے سخن کا دبستاں ترے بغیر

ڈر ہے کہ سوز دل سے نہ محفل بھڑک اٹھے

واصف اگر ہوا بھی غزل خواں ترے بغیر

علامہ اقبال مرحوم

اے کہ تری نگاہ تھی رمز شناس کائنات — اے کہ تری زباں تھی شارح معنیٔ حیات

تیرا دل ادا شناس رہبر جادۂ یقیں — واقف سر لاالٰہ عارف نکتۂ ثبات

تو نے وطن کو وہ دیا ساغر جذبۂ خودی — آج بھی ذرہ ذرہ ہے جرعہ کش مئے حیات

تیرے ہر ایک لفظ میں حکمت و معرفت کی شان — تیری ہر ایک بات میں لذت پارۂ نبات

کھول دی تو نے صاف صاف جادوگروں کی ساحری — یاد دلائے قوم کو سعی و عمل کے معجزات

تیرا مقام آگہی دام فریب سے بلند — کھائی ترے کلام سے نطق فرنگ نے بھی مات

تیری قلندرانہ زیست تیری وہ عارفانہ موت

زندہ رہے گا تیرا نام تا بقیام شش جہات

حضرت مفتی اعظم

مرے ہر سانس سے ہے کاوش ضبط فغاں پیدا — کہ گلشن میں نہیں ہے آج کوئی رازداں پیدا

یہ کس کا قصۂ غم صفحۂ فطرت پہ لکھا ہے — کہ ہر نقطے سے ہے اک لمعۂ شوق نہاں پیدا

رگ خس میں دل بلبل کا خون گرم جاری ہے — بڑی مشکل سے ہوتا ہے مزاج آشیاں پیدا

سکوت گل پہ کتنے چہچے قربان ہوتے ہیں — چمن میں جب کہیں ہوتا ہے اک طرز بیاں پیدا

تری کوتاہ بینی آدمی کی قدر کیا جانے — باندازِ نظر ہوتا ہے اوج آسماں پیدا

ابھی اک اہل دل اس جادۂ ہستی سے گذرا ہے — بہر نقش قدم ہے گلستاں در گلستاں پیدا

خزانہ علم و حکمت کا چھپا کر لوگ آئے ہیں — ہوا ہے خاک دہلی میں اک تازہ جہاں پیدا

ؔ احقر کے والد ماجد حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ (نور اللہ مرقدہ) بھی دہلی میں مدفون ہیں۔ اور استاد مرحوم نواب سراج الدین احمد خاں سائل بھی وہیں مدفون ہیں۔ (واصف)

اٹھا کر ایک مشت خاک دیکھو چشم باطن سے
تو ہوگا ایک اک ذرے سے گنج شائیگاں پیدا

سکھایا اک فقیر رازداں کی موت نے آصف
کہ یوں مر کر کیا کرتے ہیں نام جاوداں پیدا

تاریخ وفات مولانا محمد علی جوہر المتوفی ۴ جنوری ۱۹۳۱ء

رفت از ما جوہر شمشیر ہند
چوں نگرییم اے شہ بالا و پست

ایں ندا آمد کہ سال فوت او
مرد در لندن زعیم مشرق ہست

۱۳۴۹ھ

نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی

سائل وجہ فخر چمن تھا بیشک
سائل نور شمع وطن تھا بیشک

حاصل تھی جو ہم نامی شاہ دہلی
سائل شاہنشاہ سخن تھا بیشک

چھوٹوں پہ محبت کی نظر کون کرے
احباب کی اب قدر ہنر کون کرے

دلی کے شرف کا تھا نمونہ سائل
میدان مباہات کو سر کون کرے

وہ علم وادب اور شرافت اس کی
وہ شوکت شاہانہ وہ عظمت اس کی

محفل میں نگاہوں کا تھا مرکز سائل
لاکھوں میں تھی ممتاز وجاہت اسکی

ڈاکٹر فضل الٰہی مخمور دہلوی

المتوفی ۲۶ فروری ۱۹۵۶ء

اجڑی ہوئی دلی کا نشاں تھا مخمور
اک ٹوٹے ہوئے دل کی فغاں تھا مخمور

افسردہ وخاموش ہے دلی آصف
سچ یہ ہے کہ دلی کی زباں تھا مخمور

تھا خرد مند نام تھا مخمورؔ
چھوڑ کر سب کو ہو گیا رخصت
پیکِ محشر خرام تھا مخمورؔ
کس قدر تیز گام تھا مخمورؔ

کیسا شیریں کلام تھا مخمورؔ
دل کو گرما کے ہو گیا خاموش
زندگی کا پیام تھا مخمورؔ
نغمۂ ناتمام تھا مخمورؔ

زندگانی کا اعتبار کھلا
چھوڑ کر ہم کو چل دیا تنہا
کس کا تھا تجھ کو انتظار کھلا
عقدۂ جبر و اختیار کھلا

چھوڑتے تجھ کو یہ نہ تھا منظور
کیا کریں ہم ترا لگہ مخمورؔ
ہم بھی چلتے مگر نہ تھا مقدور
ہم بھی مجبور تو بھی تھا مجبور

کس نے رخ تیرا ہم سے موڑ دیا
دل ہے واصف زبان تھا مخمورؔ
رشتۂ اتحاد توڑ دیا
ساتھ دل کا زباں نے چھوڑ دیا

اہل دہلی کی جان تھا مخمورؔ
تھا وہ اک مشت استخواں لیکن
شہر دہلی کی آن تھا مخمورؔ
اک مکمل جہان تھا مخمورؔ

یاد آئے گی دوستی تیری
کچھ خبر دی نہ اپنے مرنے کی
خوں رلائے گی بے رخی تیری
قابل رشک ہے خودی تیری

کیا خبر تھی کہ روٹھ جاؤ گے — دوست بن کر ہمیں رلاؤ گے
صبر و تمکین ہیں آہ اے مخمور — اپنے واصف کو آزماؤ گے

بخش دے لغزشیں تمہاری خدا — کیسے بے وقت تم ہوئے ہو جدا
تم سے کیا کیا امید تھی ہم کو — "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"

حضرت مولانا حافظ محمد اعزاز علی صاحب مرحوم

ہائے شاگرد بھی استاد کی خدمت میں گیا — موت سے کہتا ہوا لبیک وہ جنت میں گیا
بسکہ آزار سے فرقت کے ہوا تھا رنجور — استراحت کے لئے حجلۂ راحت میں گیا

مجھ سے کیوں روٹھ گئے میرا مقدر ہو کر — یہ ستم مجھ پہ ہوا لطف کا خوگر ہو کر
کس نے اعزاز علی کہہ کے پکارا تم کو — سوئے فردوس روانہ ہوئے مضطر ہو کر

اٹھ گئے تم بھی تو اب صبر کا یارا نہ رہا — آہ دنیا میں تو اب کوئی ہمارا نہ رہا
بعد مرحوم کے اب ایک سہارا تم تھے — ہم غریبوں کے لئے وہ بھی سہارا نہ رہا

والد مرحوم کی یاد میں

(وفات کے ۵ برس بعد)

زمانہ بدلا ہے آہ کیسا الم کے جھکڑ سے چل رہے ہیں
فضائیں مسموم ہو رہی ہیں فلک کے تیور بدل رہے ہیں
اٹھایا گردوں نے ایسا طوفاں کہ عقل و تدبیر ہے ہراساں
کچھ ایسا بھڑکا ہے داغ حرماں جگر کے ٹکڑے بھی جل رہے ہیں
نہ کی کبھی ہم نے قدر ان کی بڑی سہارا تھی جن کی ہستی

گئی ہے ہاتھوں سے دولت ایسی کہ بیٹھے اب ہاتھ مل رہے ہیں
نگاہیں تم نے جو پھیر لی ہیں تو سارا منظر بدل گیا ہے
رفیق آنکھیں دکھا رہے ہیں عزیز پہلو بدل رہے ہیں
جو خواب غفلت سے آنکھ کھولی عجب نظارہ یہ ہم نے دیکھا
ابھی کچھ آیا نہیں سمجھ میں ابھی تو آنکھیں مسل رہے ہیں
تمھاری وہ اک نگاہ رحمت جو تھی کبھی زخم دل کا مرہم
وہ یاد آئی ہے آج ایسی کہ دل پہ تیشے سے چل رہے ہیں
کہاں ہے اب آشیاں ہمارا فلک نے چھوڑا نہ ایک تنکا
یہ بال و پر اب جو رہ گئے ہیں زمین والوں کو کھل رہے ہیں
وہ ظرف عالی کہاں سے لائیں وہ ضبط و تمکین کس سے سیکھیں
کسے خبر تھی کہ زیر دامن مہیب فتنے بھی پل رہے ہیں
کمال احساں سے جن کو تم نے سکھائے احساں کے طریقے
وہ ان طریقوں کو پاؤں سے اچھل اچھل کر کچل رہے ہیں
سنبھالا اس کارواں کو جس نے ثبات و ایقان تھا تمھارا
بڑے بڑے رہبران دانا قدم قدم پر پھسل رہے ہیں
ہزار ہا سنگ راہ آئے تمھاری فکر رسا کے آگے
مگر یہ دیکھا کہ سوکھے پتے ہوا سے گویا اچھل رہے ہیں
کہاں وہ ایثار و جاں فشانی کہاں وہ اخلاق و مہربانی
یہاں تو اوضاع زندگانی ہوس کے سانچوں میں ڈھل رہے ہیں
اگرچہ روشن دماغ بھی ہیں اگرچہ دل بھی بہت منور
مگر یہ شعلے ہیں ساز شوں کے چراغ کینے کے جل رہے ہیں

کہاں وہ نباضِ دین و ملت کہاں وہ نکتہ رسِ سیاست
یہ اہلِ دانش یہ اہلِ حکمت دماغ سب کے پگھل رہے ہیں
نہیں کھلونا یہ جامِ عرفان امین بننا نہیں ہے آساں
یہ جانے کیا چاہتے ہیں ناداں کہ طفل صورت مچل رہے ہیں
نہ تھے کبھی ہم بھی ایسے عاجز چٹان تھا حوصلہ ہمارا
پڑی مصائب کی چوٹ ایسی کہ دل سے چشمے ابل رہے ہیں
نہیں ہے آصف مجال گفتن کرے گا کیا کوئی چارہ سازی
اگرچہ سن سن کے میرا قصہ ہر اک کے آنسو نکل رہے ہیں

حضرت نوح ناروی مرحوم

(تاریخ وفات ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۲ء)

ہر بڑے چھوٹے پہ طاری یاس کا عالم ہے آج
محفلِ شعر و ادب میں نوح کا ماتم ہے آج
باغِ اردو میں خزاں کا دور دورہ ہو گیا
پتی پتی زرد ہے غنچوں کی گردن خم ہے آج
کیوں یکایک اس چمن کے پھول کملانے لگے
ہم غریبوں سے مزاجِ یار کیوں برہم ہے آج
تھا جگر کا داغ رحلت تازہ سینوں میں ابھی
جانشینِ داغ کی رحلت سے مژگاں نم ہے آج
آہ! کیا کیا صورتیں آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں
پے بہ پے منزل بمنزل حسرتِ پیہم ہے آج
کونسا شعبہ ہے وہ جس میں نہیں قحط الرجال
ایک کا دو کا نہیں اک قوم کا ماتم ہے آج
علم و فن شعر و سخن درس و ادب فکر و نظر
داستانِ زندگی کا ہر ورق برہم ہے آج
یوں تو بزمِ دہر میں آتے رہیں گے اہلِ فن
نوح سا مشفق کہاں ہو گا یہی یہ غم ہے آج
کون اس جیسا امینِ اسوۂ اسلاف ہے
کون اس جیسا نکاتِ شعر کا محرم ہے آج
کس طرح آگے بڑھائیں گے قدم اہلِ جنوں
لَو چراغِ رہگذر کی کس قدر مدھم ہے آج
جا رہے ہیں روٹھ کر دنیا سے اربابِ کرم
اہلِ دل کے دل میں جینے کی تمنا کم ہے آج

یہ حوادث کا تلاطم یہ بلاؤں کا ہجوم　　زیست کا مفہوم و منشا کس قدر مبہم ہے آج

غم سہے واصف نے اتنے غم کی عادت ہو گئی

یہ مسلسل غم ہی دل کے زخم کا مرہم ہے آج

قطعہ تاریخ وفات سلطان بیگم

زوجۂ منشی حامد حسین ساکن اردو بازار دہلی۔ متوفیہ ۶ ربیع الاول ۱۳۷۹ھ مطابق ۱۰ ستمبر ۱۹۵۹ء بروز پنجشنبہ بوقت ۲ بجے دن بعمر ۵۴ سال

ہوئی ہے جو سلطان بیگم کی رحلت　　تو دیوار و در پر برستی ہے حسرت

ہوئے مبتلا سب یکایک الم میں　　عزیزوں پہ نازل ہوئی اک قیامت

زمانے کے آزار سے مضطرب تھی　　نصیب اس کو آخر ہوا خواب راحت

خدایا منور کر اس کی لحد کو　　رہے روح بھی اس کی سرشار رحمت

کیا فکر واصف نے از روئے ابجد

تو عنوان بخشش ہوا سال رحلت

۱۳۷۹ھ

قطعہ تاریخ وفات ریاض الدین کامل نظامی دہلوی

کہتے ہیں بزم جہاں سے روٹھ کر کامل گیا　　دوستوں کا یہ خبر سن کر کلیجہ ہل گیا

حضرت سائل سے شاگردی کی نسبت تھی اسے　　چھوڑ کر سب کو وہ سوئے حضرت سائل گیا

محفل شعر و سخن پھر آج سونی ہو گئی　　اک رفیق خوشنوا اک شاعر کامل گیا

بس کہ تھا واصف اسے باغ جہاں ناسازگار

بلبلان قصر جنت میں وہ جا کر مل گیا

۱۳　　ھ　　۹۲

قطعۂ دیگر

اٹھا آج دنیا سے کاملؔ نظامی | کہ تھی اس کو منظور گردوں خرامی
تھا شعر و سخن میں وہ تلمیذ سائلؔ | ادیبوں میں تھی ذات اس کی گرامی
فلقؔ اس کی رحلت کا سب کو ہے دا صَف | خدا اپنی رحمت سے ہو اس کا حامی

ٹھہر کر ذرا فاتحہ پڑھتے جاؤ
عزیزو! یہ ہے۔ قبر کاملؔ نظامی

۱۳۹۴ھ

متفرق نظمیں

تقریباً اونیس سو نئیس عیسوی کا واقعہ ہے کہ چار نو عمر اور ہم جولی دوست کوٹلہ فیروز شاہ (بیرون دلی دروازہ۔ دہلی) میں اپنے معمول کے مطابق بغرض تفریح گئے اور ایک پر فضا مقام پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ دوران گفتگو میں نظام الملک طوسی عمر و خیام اور حسن بن صباح کا تذکرہ آگیا۔ ایک دوست نے کہا اس وقت ہم بھی چار لنگوٹیے دوست ہیں۔ کیوں نہ ہم بھی اسی قسم کا معاہدہ کریں جیسا ان دوستوں نے کیا تھا۔ یہ بات طے ہو گئی اور چاروں نے آپس میں ہاتھ پر ہاتھ مار کر قول قرار کر لیے ان دوستوں میں سے ایک راقم الحروف واصف بھی ہے اور محمد میاں جاذب قریشی دہلوی بھی۔ ایک مرتبہ ہم دونوں میں کٹی ہو گئی تھی۔ کچھ عرصے تک ایک دوسرے سے روٹھے رہے۔ پھر جاذب صاحب نے مندرجہ ذیل نظم لکھ کر بھیجی۔ اس سلسلے کی آخری نظم کے بعد جاذب صاحب نے پیش قدمی کر کے صلح کر لی اور اس طرح یہ پر لطف رنجش ختم ہو گئی۔ آخری نظم کا آخری شعر یہ ہے۔

آمد ہے آج باغ میں فصل بہار کی
فرصت نہیں ہے ہم کو غم روزگار کی

دوسرے دوست سید ابن حسن شارق دہلوی اور ماسٹر امیر الدین عامر ہیں تینوں پاکستان میں ہیں۔

ایک اجنبی دوست کے نام

۱۲ر اگست ۱۹۳۳ء

یاد ہیں وہ دن تجھے جب ہم تھے باہم آشنا — ہم پیالہ، ہم نوالہ، ہم خیال و ہم نوا
ایک دم کی بھی جدائی جب ہمیں تھی ناگوار — ہو گیا اے اجنبی اب وہ زمانہ خواب سا
گرچہ وہ اک خواب تھا لیکن بہت پر لطف تھا
خیر جو کچھ بھی ہوا ہونا تھا جو، وہ ہو گیا
ہم نے لیکن ایک پودا ساتھ بویا تھا کہیں — تجھ کو بھی وہ یاد ہوگا تو بھلا سکتا نہیں
یہ بھی تجھ کو علم ہے؟ اب وہ شجر مرجھا گیا — سوکھ کر آخر زمیں پر اس کی شاخیں گر گئیں
اک تنا ہے رہگذر میں آج اس کی یادگار
جو مری نظروں میں پیمان وفا کا ہے مزار
جب کبھی اس راستے سے میرا ہوتا ہے گذر — آہ! دل پر چوٹ سی لگتی ہے اس کو دیکھ کر
تجھ سے جب واقف ہوا اس وقت کو روتا ہوں میں — کاش مجھ کو موت ہی آ جاتی اس سے پیشتر
اس نشانی کو مٹا دوں میری یہ طاقت نہیں
تجھ میں ہمت ہو تو ہو مجھ میں تو یہ ہمت نہیں

ایک اجنبی کے دوست کے نام

(از آصف — ۱۸ر اگست ۱۹۳۳ء)

چین اب لینے نہیں دیتی پریشانی مجھے — آپ اپنی بدنصیبی پر ہے حیرانی مجھے
کر چکا گرم نوا اندوہ پنہانی مجھے — دوست رکھتی ہے مری قسمت کی ویرانی مجھے
وقت رفتہ کا تجھے گر دوست کچھ احساس ہے
یہ شکستہ دل بھی وقف اضطرار و یاس ہے
تخم حسرت کشت زار قلب میں بوتا ہوں میں — دیکھتی رہتی ہے تجھ کو آنکھ جب سوتا ہوں میں

عہدِ ماضی یاد کر کے مضطرب ہوتا ہوں میں | رات دن چونسٹھ گھڑی اس وقت کو روتا ہوں میں

حسرتِ عہدِ گزشتہ دل میں اب آباد ہے
یاد ہے پہلا زمانہ مجھ کو سارا یاد ہے

زندۂ جاوید ہے "سرو گلستانِ وفا" | ہاتھ سے میرے نہیں چھوٹا ہے دامانِ وفا
فطرۃً موجود ہے مجھ میں وہی شانِ وفا | آج بھی قائم ہے وہ دیرینہ "پیمانِ وفا"

آشنا تھا آشنا ہوں مجھ سے بے پروا ہے تو
اف رے تیری بدگمانی اجنبی کہتا ہے تو

پائے گا عاری نہ تو بے لوث الفت سے مجھے | کاش تو بھی دیکھتا چشمِ مروت سے مجھے
کچھ نہیں ہے شکوہ تجھ سے تیری غفلت سے مجھے | پہنچنا تھا رنج پہنچا میری قسمت سے مجھے

تو نے میری مہر و الفت کچھ بھی گردانی نہیں
جذبۂ اخلاص کی تصویر پہچانی نہیں

قلزمِ حرماں میں جاری ہے فنا کوشی مری | دیکھیے کیا کیا دکھائے خود فراموشی مری
بیخودی میں قلبِ محزوں سے ہے سرگوشی مری | میں ہوں سوزِ باطنی ہے یا ہے خاموشی مری

مضمحل ہستی مری ہے گل بدامانِ عدم
کھینچ رہا ہے دل مرا سوئے گلستانِ عدم

جا رہا ہوں بحر میں جس کا کوئی ساحل نہیں | چل رہا ہوں رات دن اور واقفِ منزل نہیں
زندگی میری نشاط و عیش کے قابل نہیں | میرے جذبات پریشاں درخورِ محفل نہیں

وقفِ صد آلام و کلفت یہ مری اک جان ہے
یاد رکھنا اک فسردہ قلب کو احسان ہے

(جواب از جاذب صاحب - ۲۲ اگست ۱۹۳۲ء)

ہمارے درمیاں اونچی چٹان اے دوست حائل ہے | میں تیری کہہ نہیں سکتا مگر تو میری منزل ہے

نہ تھا واللہ میں غافل مجھے تو حکم اگر دیتا ‌ ‌ ‌ جلا کر اس چٹان کو میں کبھی کا خاک کر دیتا

اشارہ تیرا اگر ہوتا فدا میں جان کر دیتا ‌ ‌ ‌ تری چوکھٹ پہ خودداری کو میں قربان کر دیتا

نہ دیکھی تو نے اگر میرے دل کی چاک دامانی ‌ ‌ ‌ رہا پابند ویرانی پریشانی و حیرانی

خبر ہے تجھ کو؟ اے سرو گلستان وفا میں نے ‌ ‌ ‌ بہائے ہیں وفا پر تیری آنسو چشم حسرت سے

تو بے پروا مجھے کہتا ہے اور میں اس کے قابل ہوں ‌ ‌ ‌ مگر شان وفا کا تیری میں قائل ہوں قائل ہوں

مجھے اے اجنبی تجھ سے گلہ ہے اور نہ قسمت سے ‌ ‌ ‌ یہ اک ٹوٹے ہوئے دل کی صدا ہے اس کو تو سن لے

ہری ہو سکتی ہے بنجر زمیں سیراب جب ہو کر ‌ ‌ ‌ بہار آ سکتی ہے گلشن میں جب برباد ہونے پر

جدا ہو کر بھی مل سکتا ہے جب قطرہ سمندر میں ‌ ‌ ‌ گلے مل سکتی ہیں لڑ کر بہم دریا کی جب موجیں

تو ہم اک دوسرے سے کیوں نہ ہم آغوش ہو جائیں

اظہار حال

از واصف - ۲۵ اگست ۱۹۳۳ء

طوفان غم بلند ہے ماہی سے تا بہ ماہ ‌ ‌ ‌ اپنا تو سارا عہد مسرت ہوا تباہ

روشن مری حیات کا پہلو کوئی نہیں ‌ ‌ ‌ ظلمت میں مبتلا ہوں سحرگاہ و شام گاہ

اسی ہستیٔ فضول کا مقصد نہیں کھلا ‌ ‌ ‌ میں جانتا ہوں زیست کو ہم معنیٔ گناہ

الفت ہے میری اب تو بنائے فسردگی ‌ ‌ ‌ بدقسمتی پہ میری ہے حالت مری گواہ

مجھ غمزدہ سے مل کے کسی کو ہو کیا خوشی ‌ ‌ ‌ تاراج ہو چکی ہے بہار امید آہ

ہر روز اک مصیبت نو کا نزول ہے ‌ ‌ ‌ چرخ ستم ظریف کی ہر وقت ہے نگاہ

یاران بزم کو دل مسرور چاہیئے ‌ ‌ ‌ کیا ہو سکے گا مجھ سے المناک سے نباہ

اے دوست صدق دل سے حقیقت گزار ہوں ‌ ‌ ‌ "صادق ہوں اپنے قول میں میرا خدا گواہ"

اس بدنصیب کی یہ دعا ہے کہ خوش رہو ‌ ‌ ‌ قائم رہے مدام تمہارا شکوہ و جاہ

دل بستگی کو بیر ہے مجھ جاں نثار سے
فرصت کہاں ہے اب الم روزگار سے

جواب از جاذب صاحب ۱۳ر اگست ۱۹۳۳ء

جلوے مری نظر میں ہیں ماہی سے تا بہ ماہ
ہے میری وسعتوں پہ تصور مرا گواہ

تاریکیوں میں دیکھتا ہوں نور کی جھلک
تابندہ ہے ستاروں کی مانند مری نگاہ

روشن ہے مجھ پہ مثل سحر مقصد حیات
مایوسیوں کا نام نہ لوں گا کہ ہے گناہ

تیری فسردگی ہے بنائے شگفتگی
سمجھا ہے تو کہ عہد مسرت ہوا تباہ

ہوتا ہے رحمتوں کا نزول آسماں سے
اے بدنصیب دیکھ جو رکھتا ہے تو نگاہ

کہتا ہوں آفریں ترے اظہار حال پر
آنکھیں ہیں تیری بند لبوں پر ہے تیرے آہ

آمد ہے آج باغ میں فصل بہار کی
فرصت نہیں ہے ہم کو غم روزگار کی

جاذب کا تخلص اب آذاقی ہے۔ پاکستان میں ہیں۔ لفٹیننٹ میجر کے عہدے سے ریٹائر ہو چکے ہیں

قصیدہ

ایم۔ بی مڈل اسکول سبزی منڈی سے جماعت ہشتم کے اور خود اپنے رخصت ہونے پر لکھا گیا

۱۹۳۶ء

گو مجھ کو نہیں ہمدم دعوائے شکر خائی
پر شاہد معنی کا قسمت سے ہوں سودائی

کیفیت دل کہتا ہوں شعر کی صورت میں
دیتا ہوں تخیل کو الفاظ سے رعنائی

دنیا کے حوادث کا آزار رسیدہ ہوں
نیرنگیٔ عالم کا ہوں ایک تماشائی

خاموش تھا مدت سے پر دل کو کہاں تسکیں
پھر دل میں ہوا پیدا جوش سخن آرائی

پھر درد جدائی سے بیتاب ہے دل میرا
پھر چھوٹ چلا مجھ سے دامان شکیبائی

سوزش سی ہے سینے میں چہرے پہ اداسی ہے
یارائے تحمل ہے نے طاقت گویائی

پرنم نہ ہوں کیوں آنکھیں یہ منزل فرقت ہے
صد حیف صبا لے کر پیغام فراق آئی

تعلیم و تعلم کا کیا خوب زمانہ تھا
اس باغ کی بھی ہم نے جی بھر کے ہوا کھائی

خطاب بہ تلامذہ

اے میرے عزیزو تم اسکول کی زینت ہو
امید سرافرازی تم کو ہے یہاں لائی

کی آٹھویں منزل بھی طے علم کے میداں کی
اب جاؤ بڑھو آگے با ہمت و دانائی

تم ملک کی عظمت ہو تم قوم کی شوکت ہو
تعلیم سے پائی ہے قوموں نے توانائی

مخلوق کی خدمت ہو مقصود حیات اپنا
بے سعی و عمل کیا ہے یہ علم ہے رسوائی

منصور و مظفر ہو تقدیر موافق ہو
ہو گلشن امکاں کی تم سے ہی چمن آرائی

فرصت ہو اگر تم کو دنیا کے علائق سے
تو یاد ہمیں رکھنا! ہوگی یہ دل آرائی

خطاب بہ اساتذہ

ہم چشم احبا سے اب میری گزارش ہے
جذبات محبت کی ہو کاش پذیرائی

تہذیب و تمدن کی بنیاد تمھیں پر ہے
وابستہ تمھیں سے ہے اخلاق کی دارائی

عیبوں پہ نظر رکھنا ہے وجہ پشیمانی
اپنوں سے حسد رکھنا ہے باعث رسوائی

قوموں کی تباہی ہے پوشیدہ عداوت میں
رنجش کبھی آپس کی انساں کو نہ راس آئی

چھوڑے ہوئے جاتا ہوں میں تم کو خدا حافظ
اسکول میں اب شاید حاصل نہ ہو یکجائی

خطاب بہ سید اعجاز حیدر ہیڈ ماسٹر

دل زندہ ہوا میرا "حیدر" کی عنایت سے
کہتی ہے اسے دنیا اعجاز مسیحائی

خوش ہوں کہ نہ کی میری توقیر میں کوتاہی
عزت سے شرافت سے کی حوصلہ افزائی

ہیں لطف و مروت کا ممنون ہمیشہ ہوں
بندہ ہوں محبت کا ہوں خلق کا شیدائی

ہم کس لئے حیراں ہوں اور کس کا کریں شکوہ
کب چرخ کو بھائی ہے احباب کی یکجائی

رخصت کی اجازت ہو ہے خوف کہیں تم کو
بار دل نازک ہو یہ سامعہ فرسائی

واصف کو کہاں فرصت افکار و مصائب سے
آلام کی کثرت نے دی درد کو گویائی

سہرا

چھڑا ہے آج طرب کا رباب سہرے سے
خوشا یہ وقت کہ ہے فیضیاب سہرے سے
ہوا ہے حسن ازل بے نقاب سہرے سے
لجائے جاتا ہے آج آفتاب سہرے سے
سلیم اختر نوشاہ میر محفل ہے
نہ کیوں ہو بزم میں دور شراب سہرے سے
بہشت حسن کی دیوی ہے طاہرہ اختر
وقار نوشہ یہ آئی ہے آب سہرے سے
کھلی ہے دل کی کلی مسکرا رہی ہے بزم
کھلا ہے آج مسرت کا باب سہرے سے
کیا ہے تاروں نے ماہ تمام کا حلقہ
ملی ہے آکے شب ماہتاب سہرے سے
رموز وجد ہیں پوشیدہ پردۂ گل میں
کھنچا ہے رخ پہ حیا کا حجاب سہرے سے
نئی فضا میں بڑھایا ہے ولولوں نے قدم
جھلک رہا ہو نہ کیوں اضطراب سہرے سے
ریاض کیف میں ہیں ہم جلیس زاھد بھی
سعید بھائی بھی ہیں ہم خطاب سہرے سے

نہ کیوں ہو رشک گلستاں یہ تہنیت واصف
مرے کلام کو ہے انتساب سہرے سے

تاریخ تعمیر جدید مسجد مدرسہ امینیہ اسلامیہ دہلی

(مسجد مذکور کی در کا ریر کندہ کیا گیا)

ایں مسجد مقدس ایں بیت رب اکبر
تعمیرش از سر نو شد دل پسند و خوشتر
دارالعلوم یعنی گردش مثال ہالہ
و ویں سجدہ گہ در و نش مثل مہ منور
در عہد اہتمام آں صاحب معالی
کز نکہت علومش ہندوستاں معطر
علامۂ یگانہ مفتی کفایت اللہ
عزمش ہمہ مبارک سعیش ہمہ مظفر
جمعے ز اہل ایماں کردہ مساعی
صدقاً و احتساباً در بذل ہمت و زر

گر بعد سیزدہ صد پنجاہ و سہ زہجرت

گیری، رسی بسال ایں معبد مطہر

تہنیت شادی کتخدائی میاں افتخار احمد سلمہٗ ابن حکیم انوار احمد صاحب دہلوی

مقیم لاہور مورخہ ۱۸ دسمبر ۱۹۶۲ء

سر پہ نوشہ کے بندھا ہے آج سہرا زرنگار
آ گئی ہے گلشنِ دل میں عزیزوں کے بہار

افتخار احمد کے رخ پر پھول ہوتے ہیں نثار
یہ مسرت کی گھڑی ہے وجہ عز و افتخار

اک امانت تم کو سونپی جا رہی ہے افتخار
جیسے بنتا ہے کوئی اک سلطنت کا تاجدار

جانتے ہو کیا ہے وہ؟ اک بھولی بھالی سی دلھن
اس کی عزت تم سے ہے اس سے تمھارا ہے وقار

اک نئی دنیا میں امیدوں نے رکھا ہے قدم
دولت و اقبال کا ہے حق شناسی پر مدار

ہو مبارک تم کو انوار اپنے بیٹے کا نکاح
ہے یہ اک فرخندہ و پرکیف اسلامی شعار

آج اپنے فرض سے عہدہ برآ ہوتے ہو تم
خوش نصیبی ہے جو ہو فرزند بھی خدمت گزار

ماں کے دل کی آرزوئیں آج پوری ہو گئیں
مدتوں سے اس مسرت کا تھا ماں کو انتظار

ہے دعا آصف کی دونوں خوش رہیں دولھا دلھن
زیست کے ہر موڑ پر ہوں کامران و کامگار

گفتہ آید در حدیث دیگراں

شب کہ غفلت تھی دہر پر چھائی
نیند دم بھر مجھے نہیں آئی

تھی تخیل کی کار فرمائی
لمحہ لمحہ تھی حیرت افزائی

خامشی تھی جہان پر طاری
بیخودی تھی کہ نیم بیداری

غور کرتا تھا میں خدائی پر
اور یزداں کی کبریائی پر

کبھی اپنوں کی بے وفائی پر
کبھی غیروں کی کج ادائی پر

کبھی ذروں میں جا سماتا تھا
کبھی تاروں سے دور جاتا تھا

غرق تھی کائنات عبرت میں   دل فطرت بھی تھا اذیت میں
یہ بھی تھی نظام قدرت میں   رات گذری عجیب کلفت میں

ہوئی وحشت تو گھر سے نکلا میں
کوٹلے کے قریب پہونچا میں

ہر طرف اک سکوت طاری تھا   رحمتوں کا نزول جاری تھا
ہر نفس مست کامگاری تھا   پتی پتی میں نشہ ساری تھا

دہر پر میکدے کا دھوکا تھا
نیم وا شرق کا جھروکا تھا

کوٹلہ اک مقام رنگیں ہے   یادگار عروج دیریں ہے
منزل کارواں پیشیں ہے   امتحاں گاہ ہوش و تمکیں ہے

اجڑے کھنڈروں میں سبزۂ گلزار
یعنی مخلوط ہے خزان و بہار

سامنے تھا نظر کے گورستاں   نقطہ ہائے خطوط این و آں
مظہر کبریائی یزداں   سرحد کشور خیال و گماں

اک مرقع عروج و پستی کا
ایک نقشہ فریب ہستی کا

دور سے اک جوان آیا نظر   خوش لباس و متین و نیک سیر
ناتوان و ملول و خستہ جگر   ہو خزاں دیدہ جیسے نرگس تر

ایک تربت کی سمت جاتا تھا
ہلکے ہلکے قدم اٹھاتا تھا

رک گئی کائنات جب وہ رکا — جھک گیا عرش جب سر اس کا جھکا
جب وہ رسم دعا گزار چکا — کیا آنکھوں نے اس کی فصل بکا

تھرتھرائی فضائے صحن چمن
کانپ اٹھا نظام چرخ کہن

چشم حسرت سے خوں بہاتا تھا — آنسوؤں کے گہر لٹاتا تھا
کبھی تربت پہ سر جھکاتا تھا — کبھی اوپر نظر اٹھاتا تھا

اس کی آنکھوں نے کیا کہا واصف
دل نے سب کچھ سمجھ لیا واصف

صد گلستان رنگ دیوے کر — سینہ میں جوش ہاؤ ہوے کر
دل میں طوفان آرزو دے کر — آنکھ میں عزم جستجو لے کر

اے دلھن! دیکھ کون آیا ہے
کس نے صحرا میں حشر ڈھایا ہے

یہ حیا یہ حجاب کیسا ہے — نہ ہیں سرگوشیاں نہ غمزہ ہے
آج کیا بات ہے کہ پردہ ہے — درد و حرماں کا یہ مداوا ہے؟

اپنے دل کی صدا کو بھول گئی
کیا تو رسم وفا کو بھول گئی

اے کہ در آب و گل بخواب شدہ — بیں چہ دنیائے من خراب شدہ
ذرۂ شوق آفتاب شدہ — جگر و دل ہمہ کباب شدہ

عافیت گاہ جاں نواز کجاست
دامن التفات ناز کجاست

محفل آرزو تباہ شدہ — خانۂ زندگی سیاہ شدہ
حرف مطلب ہمہ نگاہ شدہ — ہر نفس کارزار آہ شدہ

آں نسیم بہار حسن کجاست
یا بلغزد کنار حسن کجاست

اے کہ از رنج زیست پاک شدہ — بے تو حالم چہ دردناک شدہ
آہ! زیں دل کہ چاک چاک شدہ — "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"

موج گریہ بہ اوج ماہ رسید
حیف زاں مہ کہ زیر چاہ رسید

غنچے کھلتے ہیں مسکراتے ہیں — قطرے سبزے پہ جگمگاتے ہیں
تارے گردوں پہ جھلملاتے ہیں — اشک پلکوں پہ لڑکھڑاتے ہیں

کیوں ابھی تک خموش بلبل ہے
کھول آنکھیں کہ موسم گل ہے

ذرہ ذرہ ہے ایک چشم نیاز — ہر گل تازہ گوش برآواز ہے
جلوہ بیروں فگن زحجلۂ راز — محو گفتار شو بعشوہ و ناز

اٹھ کہ فطرت خموش ہے اب تک
منتظر چشم و گوش ہے اب تک

آ کہ بیتی ہوئی سنائیں ہم — اس سماں کا بھی حظ اٹھائیں ہم
بخت خفتہ کو پھر جگائیں ہم — دور اس غمکدے سے جائیں ہم

ماجرا کچھ سنائیں فرقت کا
عہد تازہ کریں محبت کا

ساتھ دونوں قدم بڑھاتے جائیں   نغمۂ الفت کا گنگناتے جائیں
واردات اپنی کچھ سناتے جائیں   اور مقدر پہ مسکراتے جائیں

دور اس عالم اذیت سے
جائیں سرحد مشیت سے

کیا مبارک وہ خواب شیریں تھا   جب ترا غم بھی وجہ تسکیں تھا
آہ کیسا فریب رنگیں تھا   یا ابھی تک خمار دوشیں تھا

قافلہ شب کا دور جا پہنچا
صبح غم کا نقیب آ پہنچا

میں کہاں تو کہاں معاذ اللہ   خاک اور نور جاں معاذ اللہ
زحمت امتحاں معاذ اللہ   ظلمت خاکداں معاذ اللہ

تو منور حویلیوں میں ہے
شاد اپنی سہیلیوں میں ہے

صحن جنت میں تیرا ناز خرام   پے بہ پے جرعہ ہائے مسک ختام
دمبدم جلوہ ہائے حسن تمام   لمحہ لمحہ نوازش و انعام

تو کہاں میں کہاں معاذ اللہ
دوریٔ جسم و جاں معاذ اللہ

میں ہوں دشت جنوں میں آوارہ   عبرت انگیز ہے یہ نظارہ
دوش پہ ہے غموں کا پشتارہ   رنج فرقت سے دل ہے صد پارہ

ایک مدت سے ہوں جدا تجھ سے
اس قدر کیوں ہے تو خفا مجھ سے

ربط کیا چیز ہے جدائی کیا — نہیں قطرے سے بے خبر دریا
اٹھتی ہے جب ہوا میں کوئی صدا — مرتعش ہوتی ہے تمام فضا

سارے عالم میں گھوم جاتی ہے
ربط اجزا کا بھید لاتی ہے

خاک کے ڈھیر سے یہ آئی ندا — میرے سرتاج اے مرے آقا!
ضبط غم ہی وقار ہے دل کا — مرد ہو کر یہ حسرت بے جا

غم بھی قدرت کی اک عنایت ہے
شکوۂ غم قصور ہمت ہے

یہ جہاں کیا ہے اک مقام سفر — موت کیا ہے بس اک سلام سفر
غیر محدود ہے نظام سفر — جان آدم ہے التزام سفر

موت لرزش نقاب ہستی کی
اک کرن آفتاب ہستی کی

زندگی اک نگاہ حیرت ہے — موت اک دو گھڑی کی غفلت ہے
زیست اک قطعۂ مسافت ہے — موت اک وقفۂ سیاحت ہے

زیست لغزش غرور ہستی کی
موت جنبش حجاب ہستی کی

اک قدم اور جب بڑھاؤ گے — سرحد راز پر جب آؤ گے
سر جب اپنا ذرا اٹھاؤ گے — مجھ کو اپنے قریب پاؤ گے

دو روزہ دیک ایک دھوکا ہے
یہ بھی فطرت کا ایک غمزہ ہے

چھیڑے نغمہ زن ہے چنگ حیات   خون ارماں ہے حسن رنگ حیات
وہم بیچارگی ہے ننگ حیات   جیتنی ہے ابھی تو جنگ حیات

غم سے ہوتا ہے امتحاں دل کا
کھل نہ جائے بھرم یہاں دل کا

تاریخ تعمیر حوض جامع مسجد فیروز پور جھرکہ

ایمن الدین احمد خان ثانی   ہے از آل احمد بخش خانی
رئیس و حکم فرمائے لوہارو   ملاذ خلق و ملجائے امانی
امیر خوش گہر فرخ نژادے   اعز عصر و فخر دودمانی
بایمایش شد ایں حوض مصفے   خجستہ یادگار جاودانی
منور با صفائے آب پاکش   ز سطحش تا فضائے آسمانی
بہ صحن مسجد ایں حوض مطہر   چو از تسنیم جام ارغوانی
بہ د آصف دہلوی تلمیذ سائل   رسیدہ فال یمن و شادمانی
ہزار و سہ صد و شصت آمد و شش
ز ہجرت تا بہ نظم ایں معانی

عدو جزر اہتمام

(۱)

شعبان سنہ ۱۳۷۴ھ

یہ علم و فضل و حکمت کا مدینہ ۱ یہی ہے میرا عہد اولینہ
بَنَاهَا خَادِمُ الْاِسْلَامِ دِیْنًا ۲ اَمِیْنُ الدِّیْنِ کَهْفُ الطَّالِبِیْنَا

مَلَاذُ الْعِلْمِ ذُوْ فِكْرٍ كَرِيْمٍ ۳ وَسِيْعُ الْقَلْبِ لِلْمُتَعَلِّمِيْنَا
وَزَيَّنَهَا اَبِي الْمُفْتِي الْجَلِيْلُ ۴ كَفَاهُ اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِيْنَا
يَدًا اِرْشَادُ فِيْهَا لِلْفَتَاوٰى ۵ وَظَلَّ يُوَاصِلُ الْاِفْتَا مُتَبِيْنَا
وَقَضّٰى دَهْرَهٗ دَرْسًا وَاَوْفٰى ۶ بِهَا مِنْ عُمْرِهٖ اَزْكٰى سِنِيْنَا
وَكَانَ يُسَابِقُ الْاَتْرَابَ جُوْدًا ۷ وَعَاشَ مُبَارَكًا مَا عَاشَ فِيْنَا
فَاَعْلَاهَا ذُرٰى فَخْرٍ وَمَجْدًا ۸ بِبَذْلِ الْجُهْدِ وَالرَّأْيِ الرَّزِيْنَا
اُبَارِكُهَا وَاُفْدِيْهَا بِنَفْسِيْ ۹ وَقَاهَا اللّٰهُ شَرَّ الْحَاسِدِيْنَا
اسی میں بیٹھ کر سیکھی الف بے ۱۰ اسی کے فیض سے روشن ہے سینہ
یہیں حاصل کیا عرفاں خودی کا ۱۱ یہیں سیکھا محبت کا قرینہ
چلا ہوں اس طرح اب میں یہاں سے ۱۲ جبیں پر ہے ندامت کا پسینہ
حریف بادۂ غم کون ہوگا ۱۳ بس اب رکھ دو اٹھا کر جام و مینا
یہ مسجد مہبط انوار قدسی ۱۴ سعادت اور رحمت کا خزینہ
حسیں ہے کس قدر اللہ اکبر ۱۵ کھڑی ہو جس طرح کوئی حسینہ
اٹھا کر ہاتھ رخصت کر رہی ہے ۱۶ اَلَا هٰذَا جَزَاءُ الْمُخْلِصِيْنَا
نماز عشق کی شرط نخستیں ۱۷ وضوئے صبح با اشک شبینہ
لگا تھا جس کا کھٹکا مجھ کو اے دل ۱۸ وہ بات آخر کو ہو کر ہی رہی نا
صَبَنْتِ الْكَاسَ عَنِّيْ يَا حَبِيْبِيْ ۱۹ وَكَانَ الْكَاسُ مَجْرَاهَا الْيَمِيْنَا
نصیب اہل ایثار و وفا ہے ۲۰ زباں خشک اور مژگاں شبنمینہ
نہ چھیڑو وصف خستہ جگر کو ۲۱ کہ پہلو میں ہے اس کے آبگینہ

نگاہے یا رسول اللہ نگاہے
کہ ساحل سے چلا میرا سفینہ

عربی اشعار کا ترجمہ ۔ (۲) مدرسہ امینیہ کو قائم کیا اس نے جو دین اسلام کا خادم تھا یعنی مولانا امین الدین جو طلبا کے پناہ گاہ تھے (۳) علم کے مادی اور بلند خیال مفکر تھے۔ طالب علموں کے لئے وسیع القلب تھے ۔ (۴) اور میرے والد ماجد حضرت مفتی اعظمؒ نے اللہ ان کو کافی ہو (۵) اس میں دار الافتاء قائم کرکے اس کو زینت بخشی اور مضبوطی و استقلال کے ساتھ احکام شرعیہ کی ترویج و اشاعت میں لگے رہے (۶) انھوں نے اپنی ساری زندگی کو درس و تدریس میں گزارا اور اس مدرسے پر اپنی عمر کا بہترین حصہ صرف کیا (۷) وہ اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ ایثار پیشہ تھے اور جب تک وہ ہمارے درمیان رہے ان کی زندگی ہمارے لئے برکت و سعادت کا سبب تھی ۔ (۸) پس انھوں نے اس مدرسے کو اپنی محنت شاقہ اور حسن تدبیر سے شرف و افتخار کی اونچی چوٹیوں تک پہنچا دیا (۹) میں اس مدرسے کا دعا گو ہوں اور اس پر اپنی جان فدا کرتا ہوں۔ اللہ اس کو حاسدین کے شر سے بچائے (۱۶) دیکھو یہ ہے صلہ وفاداروں کا (۱۹) ازعمرو بن کلثوم بتصرف قلیل ۔ اے میرے محبوب تو نے مجھے جام شراب سے محروم کر دیا حالانکہ اس کا دور دائیں ہاتھ کی جانب سے چلنا چاہیئے تھا (اور میں دائیں ہاتھ پر تھا)

(۲)

تحصیل عشق و رندی آساں نمود اول

صفر المظفر ۱۳۷۵ھ

یہ علم و فضل و حکمت کا مدینہ
جو ہے واصف کا عہد اولینہ

دیا تھا میں نے استعفا یہاں سے
کہ تھا گرداب میں میرا سفینہ

کیا مجلس نے نامنظور اس کو
بٹھایا دل پہ الفت کا نگینہ

بڑھا دی اور کچھ توقیر میری
تشکر سے ہوا معمور سینہ

عطا اک عہد کا سد کو ہوا ہے
سعادت اور عزت کا خزینہ

نگا ہے ساقی کو تو نگا ہے | کہ صہبا تند و نازک تر ہے مینا
نظر آیا سواد منزلِ دوست | جبیں سے اپنی اب پونچھو پسینہ
بیادِ عظمت مفتیٔ اعظم | مری جانب بڑھا دو جام و مینا
خریداروں کی ہے جوہر شناسی | نگاہوں پر چڑھا دل کا نگینہ
یقین و عزم سے بنتا ہے الماس | وگرنہ کیا ہے دل جز آبگینہ
کشش رکھتی ہے آنکھ اہلِ نظر کی | ابھر آتا ہے مٹی سے دفینہ
ملا کرتا ہے پیاسے کو سمندر | اگر ہو جائے مژگاں شبنمینہ
گدازِ غم اگر ہو تجھ کو حاصل | تو جڑ سکتا ہے دل کا آبگینہ
عنایت ہو دلِ عاصی کو یارب | مناجاتِ سحر سوزِ شبینہ

تری توفیق کا طالب ہے واصف
عطا کر عزم و ہمت کا خزینہ

(۳)

جانم بسوخت آخر در کسب ایں فضائل

رمضان المبارک ۱۳۷۶ھ

بنام ایزدِ دانا و بینا | سکھایا جس نے جینے کا قرینہ
اگر وہ بیچ میں آڑے نہ آئے | تو نا ممکن ہو مجبوروں کا جینا
اُسی کے ہاتھ میں ہے رزق و عزت | هُوَ الْجَبَّارُ خَيْرُ الرَّازِقِينَا
بہ نعتِ سید اولادِ آدم | اَمِينُ الْمُوحٰى خَتْمُ الْمُرْسَلِينَا
صفاتِ خالقِ اکبر کا پرتو | نبوت کی انگوٹھی کا نگینہ
ہزاراں رحمت و تسلیم و تبریک | عَلٰى مَنْ كَانَ مَاوَى الْمُلْتَجِينَا
سناتا ہوں میں اک طرفہ حکایت | دَ فِيهَا عِبْرَةٌ لِلْاٰخِرِينَا

ملی تھی مجھ کو خدمت اک چمن کی — ہوا تھا دل تشکر کا خزینہ
یہ سمجھا تھا میں اس نعمت کو پاکر — ترقی کا ملا ہے مجھ کو زینہ
گناہوں سے دھلی ہے زندگانی — کہ ہے چھایا ہوا نفس کمینہ
اگر اس باغ کی خدمت بھی ہو جائے — تو شاید پار ہو جائے سفینہ
نہ تھا میں بے خبر اس فلسفہ سے — کہ غم کھانا ہے اور غصے کو پینا
بنایا نفس کو کوہ تحمل — مرا دل گرچہ تھا اک آبگینہ
نتیجہ منتظم بن کر ملا کیا — یہ قصہ بھی ہے عبرت کا خزینہ
عطا مجھ کو جو یہ خدمت ہوئی تھی — بظاہر تھا وہ احساں کا سفینہ
کہاں وہ مسند فخر و مباہات — کہاں یہ و آصفِ کمتر کمینہ
کہاں اک بے ادب نا اہل گستاخ — کہاں عظمت گہ وادیٔ سینا
مگر کیا راز تھا اس اعتنا میں — اگر سوچو تو آ جائے پسینہ
اگر ہو ناپسندیدہ کوئی دوست — گرانے کا ہے اس کے یہ قرینہ
گراؤ اس کو اونچے پر چڑھا کر — کہ ممکن ہی نہ ہو پھر اس کا جینا
بصیرت پر مری روشن ہے ہر راز — نہیں ہے بند میری چشم بینا
نہ حاصل اعتماد باغباناں — نہ نکلا ہمدموں کے دل سے کینہ
اٹھائی میں نے تنہا ایسی محنت — ہوا بس ایک ہی خون اور پسینہ
ہوئی نیزوں کی کچھ ایسی بوچھاڑ — کہ زخموں سے ہوا گلزار سینہ
کسی کے ہاتھ میں دامن تھا میرا — گریباں سے کسی کو بغض و کینہ
مچائی لوٹ ایسی میرے دل پر — کہ میری نیند کو بھی مجھ سے چھینا
غرض فرمائی مجھ پر ایسی بے رخے — کہ مشکل ہو گیا بس میرا جینا
یہ تھا ناموس نسبت کا تقاضا — جھکے ہرگز نہ تمکین کا سفینہ

وراثت باپ کی کچھ بھی نہ پائی — فقط ہوں ایک فرزند نرینہ
یہاں ہے بانگی الحمد للہ — کہ دل بے لوث ہے اور چشم بینا
یہ تھی بد قسمتی یا خود فریبی — نہ آیا چاپلوسی کا قرینہ
نہ یوں میں نے کبھی آنسو بہائے — کہ ہو جیسے کوئی پرفن حسینہ
عجب معیار ہے اہل جہاں کا — کہ آنسو ہے صداقت کا نگینہ
خوشامد چاہتے ہیں اہل ثروت — نہ ہو ایسا تو پھر ہوتا ہے کینہ
پشیمانی ہوئی آخر میں حاصل — زباں خاموش حیراں چشم بینا
قدم رکھنا نہ تھا اس رہگذر میں — ہوئی رسوائی آخر کو ہوئی نا
مصفا جان کر پینا ہے اس کو — سحر کو گر ملے دردِ شبینہ
چلو واپس چلیں اس گلستاں سے — گریباں اور دامن کو ہے سینا
نہ راس آئی ہوا صحن چمن کی — اٹھا کر لے چلو اب جام و مینا
گوارا نہ ہے تخت سلطنت سے — ملے عزت سے گر نانِ جوینہ
ترا دل اب تو ہو جائے گا ٹھنڈا — حسودا عیب گیرا نکتہ چینا
نہیں ہوتا شعور حق و باطل — اگر ہو منصفوں کے دل میں کینہ
تاثر پر تدبر کی بنا ہو — تو کام آتی نہیں پھر چشم بینا
بڑے ہی باخدا یہ ناخدا ہیں — خدا نے جن کو سونپا ہے سفینہ
نظیر ان کی نہیں فکر و نظر میں — بڑے ہی باخبر دانا و بینا
قدم رنجہ نہ فرمایا کسی نے — یہاں کھانا تھا مجکو بے صفینہ
لڑانے کی سیاست چل رہی تھی — نہ تھا کچھ امتیاز سنگ و مینا
اکھاڑہ بن گیا صحن گلستاں — ہوا تاریک یہ روشن مدینہ
توجہ جب کبھی میں نے دلائی — تو الٹا ہو گیا مجھ سے ہی کینہ

فراست ہے تمھاری قابل داد — ابھارا خوب مٹی سے دفینہ
تعالی اللہ یہ مردم شناسی — یہ انداز نظر فکر حسینہ
اتارو اپنے اوپر اپنا غصہ — نکالو اپنے اوپر اپنا کینہ
مجھے تم نے دیا ہو کچھ تو لے لو — فَاِنَّ اللّٰہَ خَیْرُ الْوَارِثِیْنَا

بحمد اللہ مرا دل مطمئن ہے
نہیں ہے میری مژگاں شبنمینہ

بہ تقریب واپسی از حج و زیارت جناب حاجی فقیر محمد صاحب سوداگر تمباکو

(پاٹانالہ لکھنؤ)

پیش کردہ منشی محمد قمر الدین صاحب دہلوی

خدا کا جو اک بندۂ پاک طینت — ہوا تھا سفر کے لیے ہم سے رخصت
رفیق سفر تھیں ہماری دعائیں — ہمیں گو میسر نہ تھی اس کی صحبت
تمنائے دیدار لے کر گیا وہ — غم عشق بھی ہے خدا کی عنایت
ہمارے دل مضطرب کی نہ پوچھو — نہ پوچھو کہ ہے کس کا یہ سوز فرقت
نظر سے بہت دور ہے اس کا جلوہ — منور ہے اس سے مگر دل کی خلوت
ادائے فریضہ سے فارغ ہوا تو — مبارک ہو تجھ کو یہ حج و زیارت
غنی وہ ہے جو ہے فقیر محمد — خدا نے دیا ہے تجھے مال و دولت
وفا کی سعادت بھی تجھ کو ملی ہے — مزین ہے ایثار سے تیری سیرت
خدا تجھ کو اپنی رضا سے نوازے — عطا ہو تجھے دین و دنیا کی عزت
ہمارے تصور میں کیا کیا نہ آیا — وہ روضے کی جالی وہ انوار رحمت
حضوری کی لذت سے مسرور ہو کر — وطن کی طرف تو نے فرمائی رجعت
تجھے دیکھ کر ہم کو وہ یاد آئے — نگاہوں میں پھرنے لگی ان کی صورت

ادھر آگہ میں تیری آنکھوں کو چوموں ان آنکھوں نے لوٹی ہے کیا کیا سعادت
ذرا سر کو آنکھوں سے میری لگا دے کہ اس پر ہے گرد رہِ کوئے حضرت
تری طرح واصف بھی شیدا ہے ان کا
یہ وہ در ہے جس میں نہیں ہے رقابت

بہ تقریب واپسی از حج و زیارت جناب شیخ محمد اسلم صاحب دہلوی متعلم بی اے آنرز دہلی کالج

پیش کردہ عبدالسلام دہلوی متعلم کالج مذکور

خدا کا جو اک بندۂ پاک طینت ہوا تھا سفر کے لئے ہم سے رخصت
گوارا نہ تھی گو ہمیں اس کی فرقت مگر کیا کہیں کس سے ہے ہم کو نسبت
نظر سے بہت دور ہے جس کا جلوہ منور ہے اس سے مگر دل کی خلوت
رفیق سفر تھیں ہماری دعائیں ہمیں گو میسر نہ تھی اس کی صحبت
یہ کالج کی مشغولیت کا زمانہ یہ عہد جوانی یہ ذوق اطاعت
حضوری کا ارمان تھا اس کے دل میں غم عشق بھی ہے خدا کی عنایت
ادائے فریضہ سے فارغ ہوا تو مبارک ہو تجھ کو یہ حج و زیارت
محمد کی الفت میں اسلم رہا تو خدا تیرے جذبے کو رکھے سلامت
خدا تجھ کو اپنی رضا سے نوازے عطا ہو تجھے دین و دنیا کی عزت
ہمارے تصور میں کیا کیا نہ آیا وہ روضے کی جالی وہ انوار رحمت
حضوری کی لذت سے مسرور ہو کر وطن کی طرف تو نے فرمائی رجعت
تجھے دیکھ کر ہم کو وہ یاد آئے نگاہوں میں پھرنے لگی ان کی صورت
ادھر آ کہ میں تیری آنکھوں کو چوموں ان آنکھوں نے لوٹی ہے کیا کیا سعادت
ذرا سر کو آنکھوں سے میری لگا دے کہ اس پر ہے گرد رہ کوئے حضرت ؐ

نئی طرح واصف بھی شیدا ہے ان کا
یہ وہ در ہے جس میں نہیں ہے رقابت

قطعہ تاریخ تعمیر مسجد و مدرسہ مقام نواگاؤں بورجائی پوسٹ لیمٹ ضلع بھروچ

با ہمت و اتفاقِ مقیمان نواگام — معمور ہوا مدرسۂ و معبدِ اسلام
اللہ کی توفیق سے پوری ہوئی تعمیر — ہے وقف عمارت یہ پئے منفعت عام
آبادیٔ مسجد بسبب رحمت رب ہے — ہوتی ہے شب و روز یہاں بارش انعام

واصف نے کہا سوچ کے یہ مصرع تاریخ
فرخندۂ و میمون ہے یہ منزل اسلام

ھ ۱۳ ۸۰

تہنیت بر واپسی از حج و زیارت مولانا فخر الحسن صاحب استاذ دار العلوم دیوبند مع اہلیہ محترمہ

حسب فرمائش مولوی قاری ظہیر الحسن صاحب مدرس مدرسہ امینیہ

ذی الحجہ ۱۳۸۵ھ

یک زباں ہے تہنیت میں آج ساری انجمن — مست و بیخود ہیں شراب معرفت سے جان و تن
حج سے فارغ ہو کے دامن اپنا بھر کر لائے ہیں — فخر دیں، فخر احبا، مولوی فخر الحسن
شوق منزل نے ہر اک منزل کو آساں کر دیا — جادہ الفت ہے گو دشوار اور رہے حد کٹھن
یا زیاب جلوہ ہونے کا شرف حاصل ہوا — اللہ اللہ! پر تو حق کی ترے رخ پہ پھبن
ان نگاہوں سے چھلکتا ہے شکوہ التفات — دولتیں لوٹی ہیں کیا کیا تونے با سرِ دلن
کچھ ہمیں بھی تو سنا اے زائر شہر حبیب — کیسے کوچے ہیں وہاں کے اور کیسے ہیں چلن
کس طرح پیتے پلاتے ہیں وہاں اہل وفا — کیسا منظر ہے وہاں کیسی ہے ان کی انجمن
کس طرح آراستہ ہوتی ہے بزم اہل دل — کس طرح ہوتے ہیں وہ آکر وہاں جلوہ فگن

تم کو رخصت کرکے کیا کیا ہم نے باندھے تھے خیال / کیا بتائیں تھی ہمارے دل میں بھی کس کی لگن

وہ غبارِ کوئے حضرت کس کو ہوتا ہے نصیب / ہاں لگا دو میری آنکھوں سے یہ اپنا پیرہن

مرحبا اے بہرہ اندوزانِ حضرت مرحبا / آفریں اے حاملانِ موجۂ بوئے چمن

آفریں اے جرعہ نوشانِ سعادت آفریں / حبذا اے حلہ پوشانِ عطائے مقترن

تھیں شریکِ زندگی بھی اس سفر میں ہم سفر / پاک باطن مکرمت آثار و عفت پیرہن

بارگاہِ حق سے ارزانی ہو اعزازِ قبول / مہرباں تم پر رہے پروردگارِ ذوالمنن

فکر کو نسبت ہوئی حاصل کسی کے ذکر سے
درخورِ تحسین و آصف کیوں نہ ہو میرا سخن

ایک ابتلا

(۱۹۶۰ء)
(مقدمہ شاہجہانپور)

اب تک ہے مجھے فتنۂ ابنائے وطن یاد / کس بات پہ آیا ہے مجھے ہائے وطن یاد

جن ذروں میں کھیلا تھا ہوئے جان کے دشمن / اللہ! مجھے صبر دے جب آئے وطن یاد

پھرتے ہیں نگاہوں میں وہ بدلے ہوئے تیور / کیوں کرتے ہیں اب مجھ کو احبائے وطن یاد

معتوبی و بیچارگی و خواری و توہین / افسوس! رہیں گے یہ ہدایائے وطن یاد

اک بیکس و رنجور مسافر پہ یہ احسان / وہ دن ہیں تصور میں وہ شبہائے وطن یاد

فرزیں نہ بنا خانۂ فرزیں میں پہنچ کر / ہے دور رخئ شاطرِ یکتائے وطن یاد

اب ہو گیا دو آتشہ وہ بادۂ کہنہ / کیونکر نہ رہے تلخئ صہبائے وطن یاد

ہے چاک ابھی تک مرا دامان و گریباں / واللہ رہیں گے یہ کرم ہائے وطن یاد

کیا خوب ادا حق ہوا احسانِ سلف کا / آتی ہے سخن سازئ ابنائے وطن یاد

اک جانِ حزیں اور وہ طوفانِ ملامت / اب تک ہے وہ ہنگامہ و غوغائے وطن یاد

جو وقت بھی آتا ہے گزر جاتا ہے لیکن / تا زیست رہے گا یہ تماشائے وطن یاد

ٹھانی ہے کہ ہاتھوں سے سل ڈالوں گا دل کو   آئیں گے اگر مجھ کو اعزائے وطن یاد

نشتر سے رگ جاں میں کھٹک جاتے ہیں واصفؔ

مجھ کو نہ کریں کاش، احبائے وطن یاد

اے صبح کے پنچھی!

اے صبح کے پنچھی اڑ جا یہ گلشن ہے بیگانہ   مل جائے جہاں اک اپنا اچھا ہے وہی ویرانہ

کلیوں کی جگہ بوٹوں میں کانٹے ہی یہاں لگتے ہیں   دانے دنکے کی جگہ پنچھی انگارے چگتے ہیں

ہر پتی پتی پہ ہے لکھا ہوا غم کا افسانہ   اے صبح کے پنچھی اڑ جا یہ گلشن ہے بیگانہ

ہے نور کا تڑکا لیکن چھایا پھر بھی اندھیرا ہے   اٹھتے ہیں دھوئیں سینوں میں کیسا گرم سویرا ہے

ملتا ہے یہاں رندوں کو خون جگر کا پیمانہ   اے صبح کے پنچھی اڑ جا یہ گلشن ہے بیگانہ

مکار کی ٹھلوے کی اس دیس میں عزت ہوتی ہے   جو جان کھپائے اپنی اس کی قسمت سوتی ہے

تج دے جو کوئی تن من دھن کہتے ہیں اسے دیوانہ   اے صبح کے پنچھی اڑ جا یہ گلشن ہے بیگانہ

آکاش سے دھرتی پر فتنوں کی آگ برستی ہے   آشاؤں کی کھیتی قطرہ قطرہ کو ترستی ہے

دل کے داغوں سے جلتا ہے مفلس کا کاشانہ   اے صبح کے پنچھی اڑ جایہ گلشن ہے بیگانہ

ہر پنچھی لیڈر ہے یہاں کا رسیا ہے شہرت کا   حقدار وہی ہوتا ہے اس کی مہر و عنایت کا

جو پیش کرے اس کو مدح و خوشامد کا نذرانہ   اے صبح کے پنچھی اڑ جا یہ گلشن ہے بیگانہ

اونچا ہے یہاں وہ پنچھی جو عیب ہر اک کے کھوجے   منقار اٹھائے اوپر اور سب سے زیادہ بولے

دل سوزی و محنت سے عاری ہو وہی ہے فرزانہ   اے صبح کے پنچھی اڑ جا یہ گلشن ہے بیگانہ

ساقی صہبا میکش کچھ بھی نہیں بس اک حسرت ہے   ٹوٹا پھوٹا ایک کھنڈر سرمایۂ صد عبرت ہے

جام و مینا بکھرے پڑے ہیں اجڑا ہے میخانہ   اے صبح کے پنچھی اڑ جا یہ گلشن ہے بیگانہ

یہ چلتی پھرتی لاشیں یہ بھوتوں کے سائے ہیں   گلشن کی فضا پر گویا موت کے بادل چھائے ہیں

وحشت سی وحشت ہے یہ بستی ہے یا ویرانہ   اے صبح کے پنچھی اڑ جا یہ گلشن ہے بیگانہ

یہ سب نفس کے بندے ہیں نفس ہی ان کا قبلہ ہے ہمدم نہ ملے گا کوئی یہاں پنچھی یہ دنیا ہے

مل جائے جہاں واصف جاؤ ڈھونڈھ وہ میخانہ

اے صبح کے پنچھی اڑجا یہ گلشن ہے بیگانہ

ابنائے زمانہ

اے وہ کہ نہیں ہے تری رحمت کا ٹھکانہ بخشا ہے مجھے تو نے بھی کیا خوب زمانہ

کس دام بلا میں مرا دل آ کے پھنسا ہے ہر شخص کی نظریں ہیں یہاں فتنہ گرانہ

سہتا ہوں کبھی اہل سیاست کی جفائیں بنتا ہوں کبھی اہل قرابت کا نشانہ

ہوتی نہیں کچھ قدر یہاں صاف دلی کی احباب کے اطوار بھی ہیں مشفقانہ

مردود ہے مردان اولعزم کا ایثار معیار صداقت ہے یہاں اشک زمانہ

اخلاص کے دعوے ہیں مگر دل میں دغا ہے ایذا کے لئے ڈھونڈھتے رہتے ہیں بہانہ

ارباب شریعت سے ہے مجروح شریعت تقریر ہر اک کی ہے یہاں مجتہدانہ

تردید نہ ہو ان کی تو رہتے ہیں رضامند حق گوئی سے ہوتے ہیں خفا اہل زمانہ

ہر ایک ضرورت ہوئی اب وجہ اباحت ہے دین کی تیسیر تقاضائے زمانہ

ماضی کا تصور ہے یہاں ایک توہم اسلاف کا اسوہ ہے فقط ایک فسانہ

شرمندہ ہوئے جاتے ہیں اصحاب دیانت لازم ہوا جاتا ہے محاسن کا چھپانا

اے دوست وہ صد سالہ نوافل سے ہے بہتر جو دم بھی گزر جائے یہاں مجتنبانہ

ہے موجب وحشت تری یہ تلخ نوائی

بے سود ہے واصف ترا دل سوز ترانہ

مجذوب کی بڑ

اصحاب سیاست کی ہم کو باتیں نہ سناؤ رہنے دو

ہم دیوانے ہیں دیوانے ہم کو نہ سناؤ رہنے دو

جو کچھ وہ کہیں اس کو مانو مشہور ان کی ہمہ دانی ہے
کیا کہیئے ان کی فراست کو بس چپ ہو جاؤ رہنے دو

خالق سے بہت ہی ڈرتے ہیں اس کے بندوں پر مرتے ہیں
دینداری کا دم بھرتے ہیں معلوم ہے جاؤ رہنے دو

اے اہل سیاست رحم کرو اسلاف کی محنت گاہوں پر
چلنے دو یو نہیں اس کشتی کا پنی نہ چلاؤ رہنے دو

یہ فقر و توکل کے گوشے یہ درس و ہدایت کے چشمے
آثار یہی ہیں پہلوں کے ان کو نہ مٹاؤ رہنے دو

مومن کو تو لذت ملتی ہے دشواری راہ الفت میں
تم دین کو اس امت کے لئے آساں نہ بناؤ رہنے دو

معلوم تمہارا علم و ہنر معلوم تمہاری فکر و نظر
اتراؤ نہ اپنی دولت پر حکمت نہ جتاؤ رہنے دو

تم چھوڑ چکے ہو وہ جادہ تم بھول چکے ہو وہ منزل
احکام شریعت کے نکتے ہم کو نہ سجھاؤ رہنے دو

تشریح کتاب و سنت کو اقوال ائمہ کافی ہیں
اپنے دل سے الٹے سیدھے تکے نہ چلاؤ رہنے دو

تم بھی تو نمونہ پیش کرو اخلاق و تحمل کا اپنے
فانی ہے یہ نشہ عزت کا مستی میں نہ آؤ رہنے دو

جو کچھ یہ متاع دنیا ہے عمر اس کی بہت ہی تھوڑی ہے
لو جائزہ اپنی غفلت کا آنکھیں نہ دکھاؤ رہنے دو

ہونی ہے کھری بلینک کڑوی یہ گھونٹ تو پینا مشکل ہے

ہاں تیز تمھارا غصہ ہے تیور نہ چڑھاؤ رہنے دو
اللہ ہی عزت دیتا ہے اللہ ہی ذلت دیتا ہے
ان خاک نشیں گمناموں کے ٹھٹھے نہ اڑاؤ رہنے دو
اللہ زیادہ دے تم کو قانع رہو اپنی کرسی پر
رندوں کی قناعت گاہوں پر نظریں نہ جماؤ رہنے دو
ہیں ایسے بھی کچھ ہمت والے فارغ ہیں جو حرص دنیا سے
اے نادانو! دیوانوں پر احساں نہ جتاؤ رہنے دو
یہ دآصف وحشی بیچارہ کہنے دو جو کچھ کہتا ہے
چھیڑو نہ اسے اے فرزانو! فتنہ نہ جگاؤ رہنے دو

سیاسی ذہنیت اور دینی درسگاہیں

رسول اللہ صلعم پر جب انتہا کر دی نبوت کی
نگہبانی خدا نے اہل حق کو سونپی امت کی
یہ فتنہ کم نہیں ہے فتنہ ہوتا رہے وآصف
کہ دینی رہنماؤں کو لگی ہے لت سیاست کی
سیاسی ذہنیت چھائی ہے دینی درسگاہوں پر
خدایا خیر ہو ختم الرسل کے دین و ملت کی
فنا کردار ہو جاتا ہے جب گفتار بڑھ جائے
ہوا کرتی ہے یونہیں فاتحہ قوموں کی عظمت کی
جاہل فکر ہیں وہ بجھ کے رہ جاتے ہیں محفل میں
مگر یہ داد دے جاتے ہیں ناموزوں طلاقت کی
الکشن کے فریب و مکر کے خوگر ہیں بظالم
ہر اک مجلس میں کرتے ہیں نمائش اپنی عادت کی
عیوب اپنے بہ قصداً دوسرے پر تھوپ دیتے ہیں
صفائی میں ہی الجھاتے ہیں اس کو اپنی تہمت کی
دکھا دیتے ہیں کڑوی بات کہہ کر دل عزیزوں کا
بھری محفل میں کھو دیتے ہیں عزت اہل عزت کی
زباں سے گاتے ہیں جمہوریت جمہوریت ہر دم
مگر خود کیا ہیں یہ ظالم نہ پوچھو ان کی نخوت کی
مدلل اس قدر ہوتی ہیں ان لوگوں کی تقریریں
کہ مل جاتی ہے محنت خاک میں اہل دیانت کی
ہوئے رخصت جہاں سے قدر جو پہچاننے والے
ملے گی داد اب کیونکر خدایا صبر و محنت کی

خبر لو اہل کشتی جلد، یہ لمحے غنیمت ہیں — بچاؤ ایسے ملاحوں سے کشتی دین و ملت کی
سیاسی ذہن کی صدق و صفا سے بن نہیں سکتی — کہ دینی تربیت کو ہے ضرورت کنج عزلت کی
مقام قرب میں وہ اہلمان پاک طینت ہیں — فرشتے بھی قسم کھاتے ہیں جن کے فضل و عظمت کی
سیاست میں دغا ہے مکر ہے ابلہ فریبی ہے — سیاست موت ہے اخلاق و تقویٰ و صداقت کی
سیاست میں شریعت کے مسائل بھی بدلتے ہیں — نگاہیں اس میں دیکھی جاتی ہیں ارباب دولت کی
اگر یہ سچ کہا ہے دین خالص مٹ نہیں سکتا — تو ہے آواز کس گوشے میں اصحاب عزیمت کی
بچاؤ درسگاہوں کو ان ارباب سیاست سے — بیاں کرتے ہو کیا باریکیاں اخلاق و حکمت کی
حفاظت دین کی جس کو وہ بخشے اس کی رحمت ہے — جہاں جاؤ وہاں بیشک جزا ہے حسن خدمت کی
سنبھل جاؤ قیامت تم پہ قائم ہونے والی ہے — کہ قدرت کو نہیں پروا تمہاری شان و شوکت کی

نہ سمجھو گے اگر اب تم تو پچھتاؤ گے آخر کو
یہ واصف ہے تو دیوانہ مگر کہتا ہے حکمت کی

مکتوب بھیجئے

(یکم دسمبر ۱۹۷۴ء)

(ہندوستان و پاکستان کے درمیان ڈاک کی آمد و رفت کھلنے پر)

اب ڈاک کھل گئی ہے تو مکتوب بھیجئے — لکھ کر کوئی غزل سوئے محبوب بھیجئے
(جی چاہتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن) — کاغذ سیاہ کیجئے اور خوب بھیجئے
آجائے جس سے خشک دماغوں کو بھی سرور — ایسی غزل شگفتہ و مرطوب بھیجئے
کہتے ہیں خط کو نصف ملاقات اہل دل — تسکین دل کے واسطے مکتوب بھیجئے
کیونکر یہاں گزرتے ہیں لمحات انتظار — کاغذ پہ رکھ کے دیدۂ یعقوبؑ بھیجئے
کس طرح جی رہے ہیں کسی کے مریض غم — تفسیر صبر حضرت ایوبؑ بھیجئے
روداد شوق اور حدیث غم فراق — لکھ لکھ کے روز بھیجئے اور خوب بھیجئے

ارباب جور کا گلہ ہرگز رقم نہ ہو
الفاظ سوچ کر جو ہوں مرغوب بھیجئے

شاید نہ ہو خلاف وفا خط کا بھیجنا
"سب ٹھیک ہے" پکاریئے اور خوب بھیجئے

(آتا ہے داغ حسرتِ دل کا شمار یاد)
اب کیا حسابِ حاسب و محسوب بھیجئے

آخر ملیں گے بچھڑے ہوئے بھی کبھی بخیر
کچھ اور صبر کیجئے۔ مکتوب بھیجئے

حرف دعا و عرض نیاز و سلام شوق
کافی ہے بس۔ یہ تحفۂ مندوب بھیجئے

یاران تیز گام جو فرصت ملے کبھی
کچھ تو۔ بنام واصف معتوب بھیجئے

عملیات

کیا خوب نفع بخش یہ دھندا ہے جھاڑ پھونک
امت کے سب دکھوں کا مداوا اسی میں ہے

ذوق لطیف کے لئے عمدہ غذا ہے یہ
خالق کی صنعتوں کا نظارا اسی میں ہے

جس کی جھلک بھی حوروں نے دیکھی نہ ہو کبھی
اس حسن بے مثال کا جلوہ اسی میں ہے

زخمی ہوئے نبیؐ کے قدم جس کے واسطے
اسلام کا وہ مقصد اعلیٰ اسی میں ہے

خیر الامم کا آج یہ کتنا اہم ہے کام
شرم و حیا طہارت و تقویٰ اسی میں ہے

اولاد کی کسی کو جو خواہش ہو بی بیو!
خال سیاہ ڈھونڈھو وہ نکتہ اسی میں ہے

بیشک بہت بڑی ہے یہ خدمت عوام کی
اور کیمیا بنانے کا نسخہ اسی میں ہے

حقانیت کا مظہر و منشا یہی ہے آج
روحانیت کا کھیل تماشا اسی میں ہے

واصف یہ کیا ہوا ہے تجھے بس خموش رہ
گھٹنا نہ اپنا کھول کہ پردہ اسی میں ہے

حق وفاداری

تھا جن کا کئی پشت سے عزلت میں بسیرا
ان کو بھی سیاست کی ہیمان نے گھیرا

واللہ سیاست کی رسائی ہے غضب کی
جا ڈالا ہے زہاد کی خلوت میں بھی ڈیرا

پیدا کیا ایک مسئلہ گوشے سے نکل کر — اک نکتہ سے شیرازۂ امت کو بکھیرا

منشائے پیمبر ہوا یکسر نظر انداز — کیا خوب احادیث کا رخ اصل سے پھیرا

اب آئیں ذرا صورتِ حالات بھی دیکھیں — اقوالِ سلف کو تو بہت دیر ٹھنگیرا

بے ریب د خطا ہوتی ہے مومن کی فراست — بہتر ہے کہیں ان سے تو یکسانہ پھیرا

کس طرح بڑھائیں گے قدم اہلِ عقیدت — اب بزمِ طریقت میں بھی چھایا ہے اندھیرا

دولت کا ہے چسکا کہیں شہرت کی ہوس ہے — لہراتا ہے گمرہوں پہ تملق کا پھریرا

دن چڑھنے پہ کیا گزرے گی ملت پہ عزیزو! — آزادیٔ انساں کا ابھی تو ہے سویرا

اب نورِ صداقت کو کہاں ڈھونڈنے جائیں — ہر سو نظر آتا ہے اندھیرا ہی اندھیرا

ایمان کی چنگاری سلامت رہے واصف
دل منتظرِ رحمتِ غفار ہے میرا

علمائے سوء

ہے دل میں عوام کے تمھاری عزت — تم کو یہ سمجھتے ہیں ضیائے ملت

اے مولویو! ان کو ہے الفت تم سے — رکھتے ہیں یہ بے لوث عقیدت تم سے

کہتے ہیں یہ سالارِ شریعت تم کو — گردانتے ہیں حاملِ سنت تم کو

عالم سے جو رکھتے ہیں عقیدت عامی — آجائے اگر اس میں کبھی کچھ خامی

پھر ردِ عمل اس کا برا ہوتا ہے — نفرت کا بھی پھر جوش سوا ہوتا ہے

دیکھو! انھیں نزدیک نہ آنے دینا — بس دور سے نذرانے تم ان سے لینا

نزدیک جو آئیں گے تمھارے اک بار — اور پاس سے دیکھیں گے تمھارا کردار

ہوں گے علمائے حق بھی سارے بدنام — ہر ایک کو پھر دیں گے یہ کھل کر دشنام

دلچسپ و مزین ہے تمھاری رفتار — بس دور سے اچھا ہے تمھارا دیدار

پردہ ہی رہے بیچ میں حائل دیکھو! — پاس آئیں تمھارے نہ یہ جاہل دیکھو!

ہے اوج پہ مانا کہ تمہارا اختر	ہیں لوگ طرفدار تمہارے اکثر
لیکن ہے بہت قریب یوم مشہود	جب بدلہ ہر اک عبد کو دے گا معبود
ہوگا نہ وہاں کوئی مددگار و ظہیر	کھل جائے گا پشتارۂ زردار و فقیر
کہتا ہوں یہ کھا کر قسم بیت عتیق	کام آئے گا کوئی نہ صاحب نہ رفیق
اے مولویو! فکر نہ کرنا ہرگز	کل کے لئے دکھ آج نہ بھرنا ہرگز
یارب ہے دکھی تیرے نبی کی امت	ہو جائے ادھر بھی تری چشم رحمت

واصف کو رضا اپنی عطا کر یارب
زخمِ دِلِ محزوں کی دوا کر یارب

سعدی می فرماید

ہر کہ آمد عمارت نو ساخت	رفت و منزل بدیگرے پرداخت

واصف می گوید

ہر کہ آمد بفکر نو پرداخت	بر عمارات و خانہ یا بر ناخت
اول آثار رفتگاں بر کند	بیخ و بنیاد کہنہ برانداخت
ریخت و بر کند و در شکست و فگند	امن و راحت زجان و دل در باخت
بس تر آراست پار کہاؤ چمن	کا بک و کاخ و شارع نو ساخت
مدتے بخت ہم چنیں ہوسے	غلغلہ تا باوج چرخ انداخت

روزگار ایں چنیں نماند بسے
رفت و منزل بدیگرے پرداخت

نیابت انبیاء

ہو جس کو میسر علماء کی صحبت	لاریب وہ بندہ ہے بڑا خوش قسمت
لیکن علمائے عصر حاضر افسوس!	ہے سر بیں ہوا جن کے بجائے حکمت

ظاہر میں مزین ہیں سب ان کے اعمال | باطن میں ہے کچھ اور ہی ان کی حالت
اللہ تجھے دور ہی رکھے ان سے | ہے ان سے الگ رہنے میں امن و راحت

یوں دل میں رہے گی یہ عقیدت باقی
نائب ہیں نبی کے علمائے امت

سعدی می فرماید

اگر ز باغ رعیت ملک خورد سیبے | بر آورند غلامان او درخت از بیخ
بہ پنج بیضہ کہ سلطاں ستم روا دارد | زنند لشکریانش ہزار مرغ بہ سیخ

واصف می گوید

اگر ہو ہر کس و ناکس بھی ہمسر سلطان | گڑے نہ کیوں دل مخلوق میں عذاب کی سیخ
جو ہو گا صاحب قدرت کبھی ید جمہور | لگے گا جان کو خوف تشدد و تسلیخ
پناہ و داد رسی ہو گا لفظ بے معنی | کھنچے گا اسوۂ اسلاف پر خط تنسیخ
مٹائی جائے گی تصویر عظمت شاہاں | بھلائی جائے گی احسان و عدل کی تاریخ
نئے نئے نظریات ہوں گے پیش نظر | شعار کہنہ کی ہو گی مذمت و توبیخ
ستم رسیدہ کلیجوں میں ہوک اٹھیگی | نکل ہی جائے گی خارا کے موتھ سے بھی الامان چیخ
چو اقتدار بجمہور می شود تقسیم | بر آورند درختانِ ہمگناں از بیخ

زمانہ نیست سخن فہم دم مزن واصف
کہ نیست داد سخن جز ملامت و توبیخ

رباعیات و قطعات

(١)

لے ڈوبے کہیں نہ رہبری کا چسکا — یہ اہلِ غرض سے دل لگی کا چسکا
دروازے پہ رہتی ہے بہت ہی رونق — کیا خوب ہے حکام رسی کا چسکا

(٢)

اک عاشقِ ناشاد نے کل مجھ سے کہا — باقی نہیں اب عشق میں لذت بخدا
معشوق سے کس کو ہے وفا کی مہلت — ہے شام و سحر قوم سے تجدیدِ وفا

(٣)

اس قوم کو قسمت نے ایسا مارا — ادبار سے اب تک نہ ملا چھٹکارا
دہری ہوئی جاتی ہے کمر مفلس کی — ہے پیٹھ پہ آزادی کا پشتارا

(٤)

دلی میں مبارک ہو تمہارا آنا — اور تحفۂ اخلاص و مودت لانا
دلی کے مشاعروں میں آنے والو — دلی پہ فاتحہ بھی پڑھتے جانا

(٥)

ذرا دیکھو تو اِن حضرت کا چہرہ — بندھا ہے لیڈری کا جن کے سہرا
جو حاصل اقتدار ایسوں کو ہو جائے — وہ نہ کہ رہا منزلت ماند نہ رہا

(۶)

سب نے مجھے غیر انجمن میں سمجھا
اک سبزۂ بیگانہ چمن میں سمجھا
گو میں بھی اسی خاک کا پروردہ ہوں
اپنوں نے ہی اجنبی وطن میں سمجھا

(۷)

آزاد ہوئے غنچۂ خاطر نہ کھلا
اب کس سے کہیں اور کریں کس کا گلہ
بے چین ہیں ارواح شہیدان وطن
قربان ہوئے اور صلہ کچھ نہ ملا

(۸)

انعام اتارا تھا خدا نے جو فلک سے
تھا عام مگر بن گیا حصہ وہ غنی کا
اللہ رے بیگانہ وشی ہم وطنوں کی
ہے لطف وطن میں بھی غریب الوطنی کا

(۹)

معمور ہست از غم و اندوہ شام ما
ممزوج خون قلب صبوحئ جام ما
احوال ما مپرس کہ تاب کلام نیست
گفتار ما خموشی و حیرت کلام ما

(۱۰)

بہر عوام چہ جمہوریت چہ سلطانی
بجز سلامت و انصاف احتیاجے نیست
چو شاہ پند نگیرد ہمی شود معزول
مزاج خلق چو فاسد شود علاجے نیست

(۱۱)

یہ نسل کی تعیین خدا کی قدرت
یہ ابیض و رنگین خدا کی قدرت
انسان سے انساں نہ چھو جائے کہیں
فطرت کی یہ توہین خدا کی قدرت

(۱۲)

کیا عظمت ایمان یہی ہے اے دوست
کیا خدمت قرآن یہی ہے اے دوست
وہ دعوت و حکمت یہ حصول منصب
کیا اسوۂ نعمان یہی ہے اے دوست

(۱۳)

اب کیا ہوئی وہ شانِ عزیمت اے دوست
کیوں آج ہے تو مائلِ رخصت اے دوست
ممکن نہیں یکجائی جبن و ایمان
ہے یاد؟ وہ فرمانِ نبوت اے دوست

(۱۴)

اے صاحبِ ارشاد و ہدایت ہیہات
تو اور یہ بے مغز سیاست ہیہات
کیا اب بھی نہیں لغزشِ پا کا احساس
کب تک ہے یہ باطل کی حمایت ہیہات

(۱۵)

کچھ یاد بھی ہے تجھ کو حکیمِ ملت ؟
انگریزی کی تعلیم سے کیوں تھی نفرت ؟
ہندی سے نہیں ہے کیا عقائد میں خلل
سید کی روح پر خدا کی رحمت

(۱۶)

آزادی کا انجام یہی ہے اے دوست؟
قربانی کا انعام یہی ہے اے دوست؟
تخریبِ معابد سے ہو تعمیرِ وطن ؟
اب سب سے بڑا کام یہی ہے اے دوست؟

(۱۷)

کیا اسوۂ احرار یہی ہے اے دوست؟
انسان کا کردار یہی ہے اے دوست؟
ناموسِ پیمبر نہیں جس میں محفوظ
جمہور کی سرکار یہی ہے اے دوست؟

(۱۸)

واعظ نے بدل ڈالے شریعت کے حدود
اسلام کو نیشن میں کیا ہے محدود
کیا شان ہے خودساز مسائل کی ترے
مقبول وہ ہے آج جو کل تھا مردود

(۱۹)

کہتے ہیں کہ واصف ہے بڑوں کی اولاد
لاریب کہ ذی شان تھے اس کے اجداد
محجوب سا ہوتا ہے یہ سن کر واصف
فریاد ز توہینِ بزرگاں فریاد

(۲۰)

در راہ چناں رو کہ اشارت نکنند　　در بزم چناں شو کہ زیارت نکنند
با خلق چناں زی کہ چو خسپی در خاک　　بر مرقد پاک تو عمارت نکنند

(۲۱)

کچھ اپنے وطن کی بھی سناؤں روداد　　سب ٹھیک ہے ناصح کا تو یہ ہے ارشاد
چھلنی ہے جگر دل کے ہیں ٹکڑے ٹکڑے　　کیا خوب کہ وہ آصف ہے وطن میں آزاد

(۲۲)

کہا جو آپ نے ہندی کے ہو رہو پابند　　مگر جناب نے اردو کو کیوں کیا ہے پسند
عجب کہ اردو کو اردو ہیں کو سنتے ہیں آپ　　نمی پسندی چو بر خود بدیگراں مپسند

(۲۳)

لگا ہے اردو میں اب سنسکرت کا پیوند　　نیا زمانہ نئے حکمراں نئے یہ بندھ
عوام اس کو نہ سمجھیں تو کیا شکایت ہے　　"رموز مملکت خویش خسرواں دانند"

(۲۴)

سنا ہے اس کو عزیزوں نے پارٹی دی ہے　　کیا ہے جس نے ہزاروں کو خانماں برباد
وہ خون عزت و ناموس اور یہ عیش وطن　　ٹپکی ہے غیرت قومی پہ آہ کیا افتاد
اسیر زلف برہمن ہے بندۂ مومن　　ہوا نہ تھا ابھی قید فرنگ سے آزاد

(۲۵)

وہی تعلیم ہے اچھی وہی حکمت بہتر　　جس سے انساں کی بنے خصلت و عادت بہتر
لیکن انسان کو انسان سے نفرت جو سکھلائے　　ایسی تعلیم سے واللہ جہالت بہتر

(۲۶)

مظلوم اگر ہے تو نہ ہو تو رنجور　　اور بیٹھ نہ جا بن کے حزین و معذور

انصاف بھی ہونا ہے ہر اک ظلم کے بعد　　اللہ کی فطرت کا یہی ہے دستور

(۲۷)

مانا کہ تری زیست ہے غم سے معمور　　مانا کہ میسر ہی نہیں تجھ کو سرور
غم بھی تو ہے قدرت کی عنایت واصف　　ہے غم کا جو شکوہ تو ہے ہمت کا قصور

(۲۸)

زردار اگر خوش ہے تو بہم مزدور　　شاداں جو ہے مزدور تو منعم مقہور
فطرت کا توازن نہ بگڑتے پائے　　لا سامنے، ایسا جو کوئی ہے دستور

(۲۹)

اے داعیٔ حق علم کے روشن مینار　　سوتوں کو جگاتی تھی کبھی تیری پکار
کیوں تکیۂ و مسند پہ ہوا ہے قانع　　کیا احمد حنبلؒ کا یہی تھا کردار؟

(۳۰)

ایسے اردو سے ہو گئے بیزار؟　　اس کا جو نام لے وہ ہے غدار؟
فرقہ بندی کا ہے نشاں اردو؟　　"خوئے بد را بہانہ بسیار"

(۳۱)

عرفیؔ می فرماید

جہاں بگشتم و دردا بہیچ شہر و دیار　　بنا فتم کہ فروشند بخت در بازار

واصفؔ می گوید

نصیب آکے بکے بھی اگر سر بازار　　ہو جو ہاتھ میں پیسہ تو کیا کرے نادار

(۳۲)

یہ عرض و دعا میں جاں فشانی کب تک　　یہ تجربۂ اذا دعانِ کب تک
ایمان تو واثق ہے مگر یہ تو بتا　　واصفؔ سے تری یہ لن ترانی کب تک

(۴۷)

حضرت کو بد و نیک کی تمیز نہیں
ترمیم سے خالی کوئی تجویز نہیں
اس پستیٔ تدبیر پہ دعویٰ یہ ہے
اللہ کا قانون کوئی چیز نہیں

(۴۸)

یہ حامل اسرار و رموز قرآن
یہ رشک غزالی و حریف سحبان
اب چھوڑ کے احیائے کتاب و سنت
ہیجان سیاست پہ ہوا ہے قربان

(۴۹)

انجام محبت کی خبر کچھ بھی نہیں
آہوں میں دعاؤں میں اثر کچھ بھی نہیں
اے حسرت دل رات ہے تاریک و دراز
سو جا! ابھی آثار سحر کچھ بھی نہیں

(۵۰)

مستقبل و ماضی کی خبر کچھ بھی نہیں
جز رندی و رسوائی ہنر کچھ بھی نہیں
مژگاں کو بھگو لینے دے اے پیک اجل
تھم جا! ابھی سامان سفر کچھ بھی نہیں

(۵۱)

آزادیٔ وطن کے ہیں چرچے طیور میں
ارباب اقتدار ہیں رقصاں سرور میں
کیونکر پہنچ سکے گا یہ تحفہ غریب کو
آیا جو آسمان سے اٹکا کھجور میں

(۵۲)

آتے رہے جاتے رہے صدہا طوفان
انساں کا عدو رہا ہمیشہ شیطان
موجودہ زمانے کی سیاسی مخلوق
ہے یہ وہ بلا جس کا نہیں ہے درمان

(۵۳)

عزت جو ملے تجھ کو تو مسرور نہ ہو
اور ہو جو مسرت بھی تو مغرور نہ ہو
پستی یہ کسی کی اور بلندی تیری
ممکن ہے کہ اللہ کو منظور نہ ہو

(٥٤)

دلی کے مشاعروں میں آنے والو! اور نغمۂ اخلاص سنانے والو!
دلی کے دل کو بھی ٹٹولا تم نے؟ دل بہلا کر دلی سے جانے والو!

(٥٥)

مانا کہ بزرگوں کی نشانی ہے تو دانش میں بھی لقمان کا ثانی ہے تو
تقدیر اگر ساتھ نہ دے اے واصف مزدور بلاکش کی جوانی ہے تو

(٥٦)

محفل میں جو تو جائے تو مخدوم نہ ہو اور آئے اگر اٹھ کے تو معلوم نہ ہو
یوں جی کہ پس مرگ نہ پوچھیں تجھ کو مر کر بشریت تری معدوم نہ ہو

(٥٧)

اردو کہو یا ریختہ سمجھو اس کو گل زادۂ سمن بیختہ سمجھو اس کو
ہے کتنی زبانوں سے مرکب یہ زباں تہذیبوں کا آمیختہ سمجھو اس کو

(٥٨)

کیا خوب زمانہ تھا دیوانگیٔ دل کا کل تک جو تماشا تھا وہ آج کہانی ہے
ہاں ہاں وہ جواں اک تھا کھویا سا جو رہتا تھا صد شکر کہ یاد اس کو کچھ میری نشانی ہے

(٥٩)

تصور میں اب تک ہیں گھاتیں کسی کی وہ پہروں محبت کی باتیں کسی کی
تمھیں کچھ خبر بھی ہے اے سونے والو گزرتی ہیں کیونکر یہ راتیں کسی کی

(٦٠)

مری منزل بچھڑتی جا رہی ہے مری دنیا اجڑتی جا رہی ہے
مدد اے کارساز ہر دو عالم مری قسمت بگڑتی جا رہی ہے

(۶۱)

تمنا کو قرار آئے نہ آئے — پلٹ کر پھر بہار آئے نہ آئے
یونہیں جینا ہے اس دنیا میں وصف — یہ دنیا سازگار آئے نہ آئے

(۶۲)

یہ ذلت داد بار یہ پستی میری — یہ خستہ دلی یہ تنگدستی میری
رک جائیں گے معبود ترے کونسے کام — ہو گی نہ اگر دہر میں ہستی میری

(۶۳)

اس دور کے نادار بھی بد خو ہیں ترے — سمجھے تھے کہ بس آج سے دن اپنے پھرے
آگھیرا مفلسی نے پہلے سے سوا — نکلے جو کنویں سے بھی تو خندق میں گرے

(۶۴)

شکریۂ الطاف ادا کون کرے — مہمانوں سے کچھ شکوہ گلا کون کرے
اب اجملؔ[1] و سائلؔ[2] ہیں کہاں دلی میں — سر معرکۂ مہر و وفا کون کرے

(۶۵)

اب انجمن شعر و سخن کیا ہو گی — اب خیر سے ترتیب چمن کیا ہو گی
اب ساحرؔ[3] و سائلؔ ہیں کہاں دلی میں — اب عزت آداب کہن کیا ہو گی

(۶۶)

ان کو مرے رونے کی خبر کب ہو گی — اس گریہ و زاری پہ نظر کب ہو گی
فرقت کی مجھے داد ملے گی کیونکر — اس رات کی اللہ! سحر کب ہو گی

---

[1] حکیم اجمل خاں مرحوم [2] نواب ابوالمعظم سراج الدین احمد خاں سائلؔ
[3] پنڈت امرناتھ ساحرؔ دہلوی شاگرد مرزا غالبؔ

(۶۷)

کرتا ہے ہر اک شخص کی تو پردہ دری — اے دوست مناسب نہیں یہ خیرہ سری
کیوں ذات سے اپنی ہے تجھے بے خبری — باید کہ گہے سوئے خودت ہم نگری

(۶۸)

زندگی کا نظام برہم ہے — ولولوں کا چراغ مدھم ہے
عشرت یک نفس کا ماتم ہے — عید بھی کیا ہے اب محرم ہے

(۶۹)

ٹکڑے ٹکڑے ہیں منتشر دل کے — صف مژگاں ادھر منظم ہے
اس تکلف میں رہ نہ جائے کوئی — کہ نشانہ نرا مسلم ہے

(۷۰)

حسرت کشیٔ قلب طپاں یاد رہے گی — بیتابیٔ چشم نگراں یاد رہے گی
محروم تو اس بزم میں ہم بھی نہ رہیں گے — پر بے رخیٔ پیر مغاں یاد رہے گی

(۷۱)

رخصت ہوئے فرنگی تو ہندوستان سے — نکلے نہیں عوام ابھی امتحان سے
بھرتی نہیں خواص کی نیت کسی طرح — اٹکا کھجور میں، جو گرا آسمان سے

(۷۲)

چکھے ہیں بہت ہم نے قیامت کے مزے — آفات و بلیات کی شدت کے مزے
یہ فتنہ ہے سب فتنوں سے بڑھ کر واصف — واعظ کو جو پڑ جائیں سیاست کے مزے

(۷۳)

کیفیت اخفائے الم یاد رہے گی — حسرت نظری اے دیدۂ نم یاد رہے گی
محروم تو اس بزم سے ہم بھی نہ رہیں گے — پہ بے رخیٔ اہل کرم یاد رہے گی

(۷۴)

اس بزم کی کیا آن یہی ہے؟ ساقی!   رندوں کی یہاں شان یہی ہے، ساقی
دو گھونٹ میں آپے سے جو باہر ہو جائے   کیا مرد کی پہچان یہی ہے؟ ساقی

(۷۵)

کوئی قوم ہرگز سنبھلتی نہیں ہے   کمند بلا سے نکلتی نہیں ہے
بدلتا نہیں ہے خدا اس کی حالت   جو قوم اپنی عادت بدلتی نہیں ہے

(۷۶)

ہر اک موئے تن ہے گنہ گار میرا   مگر شکر ہے طبع فاسد نہیں ہے
نہیں غم اگر دل ہوا ہے شکستہ   کہ واللہ یہ جنس کاسد نہیں ہے
اُس انساں میں واصف نہیں کوئی خوبی
کوئی جس کا دنیا میں حاسد نہیں ہے

(۷۷)

مذکور ہے واصف تری والا گہری   ہے یہ ترے احباب کی عالی نظری
شاید کہ یونہیں ان کا کہا ہو جائے   ہے نور کا پیغام نسیم سحری